قیمت : 10/- روپے

جولائی 2009

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

- میں تعلیمی نظام کی مکمل تشکیل نو کا عزم رکھتا ہوں
- تعلیمی اداروں میں شفافیت اور جواب دہی ضروری
- نظام تعلیم میں اصلاح پر فوری توجہ
- تعلیمی سرگرمیوں میں اقلیتوں کی سرگرم شرکت
- کیپٹیشن فیس لینے پر روک
- غیر اخلاقی سرگرمیوں پر لگام

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

اردو کے ممتاز نقاد، دانشور اور ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر جناب ای. ایم. احمدی انھیں ڈی لٹ کے اعلیٰ اعزاز سے سرفراز کرتے ہوئے۔

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ
جلد۔11، شمارہ۔7، جولائی 2009

مدیر: ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپئے، سالانہ -/100 روپئے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 110 066
فون:26103938, 26103381
26179657 فیکس:26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون:26169416, 26109746

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات ..... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات ..... ادارہ 6

زبان اور تعلیم

● ہندوستان میں ابتدائی یا پرائمری تعلیم ..... عبدالعلیم قدوائی 7
● ریاست کرناٹک میں اردو ذریعہ تعلیم ..... حلیمہ فردوس 10
● گلوبلائزیشن اور اردو ..... محمد مشاہد 13
● اردو اور میں ..... مہیش بھٹ / اسلم پرویز 15

ادب

● قرۃ العین حیدر کے ادبی اور شخصی رویے ..... دردانہ قاسمی 17
● علامہ اقبال اور سبرامنیم بھارتی ..... حیات افتخار 21
● قصیدہ — ایک فراموش شدہ صنف سخن ..... ظہیر غازی پوری 24

یادرفتگاں

● حبیب تنویر زندگی کا آخری ڈراما کھیل گئے ..... عارف عثمانی 26
● قمر رئیس جیسا میں نے انھیں دیکھا ..... فیاض رفعت 29
● ملا ثریا ..... سید امتیاز الدین 32

سیاست اور ماحولیات

● بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے ..... آبگینہ نظر 34
● فضائی آلودگی اور اس کا تدارک ..... شمیم احمد صدیقی 36

کیریئر

● کیریئر سازی میں بھروسہ مند صلاح کار ..... کاشف فراہی 38

روبرو

● عبدالصمد سے گفتگو ..... حیدر علی 39

ہماری مطبوعات سے

● شہزادہ فیروز شاہ ..... اقبال حسین 42

اردو خبرنامہ ..... ادارہ 48
تبصرہ و تعارف 69
● کلیات چودھری محمد علی ردولوی ..... ایس اے رحمن .....
● انقلاب اٹھارہ سو ستاون ..... عاقل زیاد .....
● دھندلی روشنی ..... رخسانہ عابدی .....
● ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ ..... فخر الکریم .....
● اردو فکشن اور سینما ..... فیروز عالم .....
● موج موج دریا ..... منظر اعجاز .....
● مولانا اسلم جیراجپوری: ایک ہمہ جہت شخصیت ..... ابوشہیم خاں .....

بچوں کا گوشہ

● خدمت خلق ہی عبادت ہے ..... شجاع الدین شاہد 77
● حقوق و فرائض سے چشم پوشی ..... قمر غزالہ 78

آپ کی بات

■ **ڈاکٹر محمد خالد صدیقی، مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی، جنک پوری، نئی دہلی۔ 110058**

کل شام ہی مجھے خبر ملی کہ آپ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں دوبارہ چارج سنبھال رہے ہیں۔ یہ میرے لیے بڑا ہی پر مسرت لمحہ تھا۔

میرا یہ پختہ یقین ہے کہ اردو زبان کا فروغ اور اردو کونسل کی ترقی براہ راست طور پر صرف ایک ہی شخصیت سے منسوب ہے اور وہ کوئی اور نہیں ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ ہیں۔ اس لیے میری جانب سے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

■ **یعقوب میراں مجتہدی، چنچل گوڑہ، حیدرآباد۔**

آپ کی ماموری پر ایک مصرعہ پیش خدمت ہے:

''پلٹ کے برج میں پھر اپنے آفتاب آیا''

■ **امتیاز احمد انصاری، سکریٹری چھتیس گڑھ راجیہ اردو اکادمی، رائپور**

میں چھتیس گڑھ راجیہ اردو اکادمی کی جانب سے آپ کی دوبارہ تقرری پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، قبول فرمائیے۔ آپ کی پچھلی کارکردگی روز روشن کی طرح منور ہے:

تمھاری ذات سے اردو ستاروں کی طرح چمکے
تمھیں منصب ملا ہے پھر سے اردو کی قیادت کا

■ **ڈاکٹر لیاقت علی، سکریٹری، اڑیسہ اردو اکادمی، بھونیشور**

اڑیسہ اردو اکادمی کی جانب سے میں آپ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے تقرری پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حسب سابق آپ کی رہنمائی میں قومی اردو کونسل ترقی کی منازل طے کر کے اردو زبان کی ہمہ جہت ترقی کی راہوں پر برق رفتاری سے گامزن ہوگی۔

■ **ظہیر غازی پوری، بیت الادب، ہاشمیہ کالونی، ہزاری باغ، جھارکھنڈ**

کل ''اردو دنیا'' بابت ماہ جون 2009 ہدست ہوا۔ یہ خبر پڑھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ نے وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کے ایما پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا عہدہ دوبارہ سنبھال لیا ہے۔ میں اس تقرری پر آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ حسب سابق کونسل کی وساطت سے آپ اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہیں۔

■ **اقبال بیدار، گلشن اقبال، جہانگیر آباد، بھوپال (ایم. پی)**

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے آپ کا دوبارہ تقرر محبان اردو کے لیے باعث مسرت ہے۔ یہ آپ کی محنت لگن اور ایمانداری کا ثمرہ ہے۔

■ **مرزا احتشام، دکن ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، اورنگ آباد (مہاراشٹر)**

قومی اردو کونسل کی دوبارہ سربراہی پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ گزشتہ دورانیے میں آپ کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات نے اردو کے سلسلے میں امید کی جو جوت جگائی تھی تاحال قائم ہے۔ کونسل کی مسلسل کاوشوں سے اردو زبان اور لسانیات کو مسلسل فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

■ **ایم. قاسم صدیقی، سابق پرنسپل، تانگہ روڈ، دودھ پور، علیگڑھ،**

آپ کو دوبارہ اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالنے کی مبارکباد دوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے دور میں اردو کونسل نے واقعی اردو کی ترویج اور ترقی کے لیے غیر معمولی کام کیا۔ آپ کی دلچسپی کی وجہ سے اردو ادب میں ریسرچ کی زبان کی بجائے عام قاری تک پہنچی اور درس و تدریس کے نظام میں غیر معمولی کام ہوئے۔ بچوں کے لیے کتابیں درسی اور غیر درسی، کمپیوٹر غرض ہر طرح کے کاموں کو آگے بڑھایا۔

■ **زبیر احمد فاروقی، انوار قوم، مدیر اعلیٰ، ڈپٹی کا پڑاؤ، کان پور۔**

کونسل کے ڈائرکٹر کے عہدے پر آپ کے دوبارہ متمکن ہونے پر مسرت ہوئی وہ اس لیے کہ آپ کے دور نظامت میں کونسل کی زبان کے لیے جو خدمات رہی ہیں وہ لائق تحسین رہی ہیں۔ یقین کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں ان روایات کو قائم رکھا جائے گا۔

''اردو دنیا'' باقاعدہ اور وقت کی پابندی کے ساتھ موصول ہوتا ہے ساتھ ہی ''انوار قوم'' بھی روزانہ باقاعدگی سے کونسل کو ارسال/ پوسٹ کیا جاتا ہے۔ آج سے تو آپ کے نام سے جا رہا ہے اگر مانیٹرنگ ہوتی ہے تو چیک کر لیا جائے کہ یومیہ مل رہا ہے کہ نہیں۔

■ **شان الرحمٰن، رحمٰن ولا، نوگھروا، سلطان گنج، پٹنہ۔ 800006**

قومی اردو کونسل میں آپ کی واپسی کے لیے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اللہ رب العزت آپ کی نگرانی میں اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرے۔ آمین!

جون 2009 کا شمارہ دیکھا، جو مشمولات دیکھ پایا ہوں ان سے اندازہ

ہوتا ہے کہ مختلف پہلوؤں پر قلمکاروں نے جو پیش کیا ہے اس سے کتنا کچھ حاصل ہوتا ہے۔ ویسے ہر تخلیق منتخب ہے۔

شوکت حیات سے ممتاز عالم رضوی نے جو ملاقات کی ہے اور انھوں نے جو سوالات اٹھائے اور شوکت حیات نے ان کے جو جوابات دیے، ان سے روشنی حاصل ہوتی ہے۔ شوکت حیات ہمارے زمانے کے قد آور فنکار کا نام ہے۔ شوکت حیات نے زندگی کے مشاہدے، اس کے نشیب و فراز، اور حاصل شدہ تجربات کو برت کر جس طرح اپنے فن پاروں میں پیش کیا ہے وہ ان کا خاص کمال ہے۔

شمیم احمد شمیم پر آل احمد سرور کا مضمون شائع کر کے آپ نے بڑا کرم کیا۔ وہ اتنے جینئس، اتنے شعلہ بیان مقرر اور صحافت کی دنیا کے بہت بڑے آدمی تھے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ میں ان کے جو ساتھی ابھی بقید حیات ہوں گے وہ ان کی گرج سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ان کی کم عمری کی موت نے ایک بلند مرتبہ شخصیت کو دھندلکوں میں گم کر دیا۔ آل احمد سرور کا یہ مضمون بہت پر اثر ہے۔

پردیپ جین، یوسف کمال کے مضامین دعوت فکر دیتے ہیں۔ وہاب قیصر، فیروز احمد اور عطا عابدی کے مضامین جو زبان اور تعلیم سے متعلق ہیں اچھے لگے۔ عطا عابدی کے مضمون کا کینوس بڑا ہے لیکن زیادہ طویل تحریر کا متحمل نہ تو رسالہ ہے اور نہ اس کے صفحات۔ پھر بھی انھوں نے جو پیش کیا، وہ بہت بہتر ہے۔

'دہلی کی ایکولوجی' زبردست مضمون ہے۔ اقبال محی الدین کو دلی دعائیں۔ 'کائنات علی باقر' پر شہاب ظفر اعظمی کا تبصرہ خوب ہے، ان کی تحریر متاثر کرتی ہے، اسد رضا کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔

قمر رئیس صاحب کی رحلت سے سخت صدمہ ہوا، نہایت پر خلوص اور زبردست شخصیت تھی۔ پریم چند پر ان کی کتاب ابتدائی حیثیت رکھتی ہے۔ پریم چند سے ان کی عقیدت کی ایک بھرپور جھلک۔ اس سے الگ رہ کر بھی انھوں نے جتنی کتابیں لکھیں، انھوں نے کتنوں کے ذہنوں کی تاریکی دور کی۔ حال میں ان کی شاعری کا جو مجموعہ آیا اس نے بھی سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ اللہ رب العزت ان کے درجات بلند کرے اور دامن رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

■ محبوب حسن، ماہی ہاسٹل، 33، جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی

''اردو دنیا'' ماہ جون کے شمارے کے تمام مضامین نہایت معیاری، پر مغز اور معلومات افزا ہیں۔ خاص طور پر عطا عابدی صاحب کا مضمون ''اردو زبان کا دوسری زبانوں سے رشتہ'' اور غازی علم الدین صاحب کا ''اردو میں مستعمل عربی الفاظ'' میں کی گئی سیر حاصل گفتگو بے حد پسند آئی۔ رسالے کے آخر میں محمد رفیع انصاری صاحب نے آب حیات کو نہایت پرلطف اور دلچسپ طریقے سے پیش کر کے رسالے کے حسن کو دوبالا کیا ہے اس کے لیے انھیں دلی مبارکباد۔ ابن کنول صاحب نے دہلی یونیورسٹی کی ادبی خدمات کو عصر حاضر کے تناظر میں پیش کر کے ہم طلبہ پر ایک احسان کیا ہے۔

■ ظہیر حسن ظہیر، مغل پورا، نزد مسجد زبیر، مئو ناتھ بھنجن۔ (یو۔پی)۔ 275101

ماہنامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی کے اپریل 2009 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ سب سے پہلے تو رسالے کے مدیر کی حیثیت سے آپ کے نام نامی کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، مبارکباد قبول فرمائیں۔ اردو زبان کی مختلف حیثیتوں پر اس بار اداریہ بہت ہی جامع اور پر اثر ہے۔ یہ درست ہے کہ اردو اپنی سرشت میں ایک سیکولر زبان ہے، جس کی صحافت کا جنگ آزادی میں اہم حصہ رہا ہے۔ اور اب اکیسویں صدی میں جہاں یہ زبان عالمگیر حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے۔ وہیں نئی نسلوں میں رسم الخط کی شناخت کے اعتبار سے سکڑتی بھی جارہی ہے۔ آخری پیراگراف میں آپ نے بجا طور سے اہل اردو کو اس جانب متوجہ کیا ہے۔ دراصل پرائمری سطح پر اردو تعلیم پر خصوصی توجہ ہی آج اردو کے تمام تر مسائل کا حل ہے۔

رسالے کے دوسرے مشمولات میں زبان اور تعلیم کے تحت ڈاکٹر امام اعظم اور محمد جمال مصطفی کے مضامین مختصر ہونے کے باوجود معلوماتی اور مفید ہیں۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی نے غالب کے ایک متنازعہ خط پر بڑی باریک بینی سے تحقیق کی ہے اور اس پرانی بحث کو از سر نو انجام تک پہنچایا ہے کہ خطوط غالب اپنے عہد کی اہم دستاویز ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر سرور الہدیٰ نے خلیل الرحمن اعظمی کی مرتبہ 'نوائے ظفر' کا مبسوط و مدلل تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ جناب ملک زادہ جاوید کا مضمون 'لکھنؤ کی تین شخصیتیں'' بہت ہی دلچسپ ہے، لکھنؤ کا موجودہ ادبی منظر نامہ ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ جناب مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کی کتاب ''زندگی کا علمی سفر'' پر تبصرہ بھی بہت خوب اور بھرپور ہے۔ جس کے مصنف کی علمی و دینی شخصیت اور ان کے کارناموں سے قاری کو پوری واقفیت حاصل ہو جاتی ہے، ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس موضوع سے مبصر کو پوری ہمدردی اور گہری دلچسپی ہے۔

■ ''اردو دنیا'' ہر ماہ نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ مئی 2009 کا شمارہ بھی باصرہ نواز ہوا۔ مذکورہ شمارہ وقیع اور معیاری مضامین پر مشتمل ہے۔

یہ رسالہ مسلسل گیارہ سالوں سے اردو زبان کی خدمت کر رہا ہے اور روز اول سے ہی ادبی حلقے میں کافی مقبول ہے اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ متنوع معیاری مضامین اس کے توسط سے پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ اور کمپوزنگ کی غلطیوں سے بھی یہ رسالہ پاک ہوتا ہے جس کے لیے تمام اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ہماری بات میں آپ نے رالف رسل صاحب کے مضمون کا اقتباس نقل کیا ہے واقعی یہ اقتباس اہمیت کا حامل ہے اور ہم اردو والوں کو اس پر غور و خوض

کرنا چاہیے کہ ہم اپنی زبان کی ترویج وترقی کے لیے کتنی کوشش کرتے ہیں ہم صرف دوسروں پر الزام لگاتے ہیں لیکن خود اس زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے عملی اقدام نہیں کرتے واقعی یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

زیرنظر شمارے میں شامل مضامین میں نسیم احمد نسیم صاحب کا مضمون ''اردو زبان اور علاقائی بولیاں'' علی احمد فاطمی صاحب کا مضمون ''الہ آباد کا ادبی ماحول منظر اور پس منظر'' ابوبکر عباد صاحب کا مضمون ''تنقید کا منصب'' اور معید رشیدی صاحب کا مضمون ''وحشت کی غزل'' قابل مطالعہ ہیں اور قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ کیریئر کے حوالے سے چودھری نوازش مہدی اور خان قمرالزماں صاحب کے مضامین معلوماتی اور طلبہ کے لیے کافی سودمند ہیں۔

■ ایم. راگھوراؤ، ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا، (مدھیہ پردیش)

''اردو دنیا'' مئی 2009 کا شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ! ''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ مشمولات کے اعتبار سے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کا یہ رسالہ دن بہ دن نکھرتا جا رہا ہے۔

'ہماری بات' میں آپ نے رالف رسل کے مضمون کا اقتباس پیش کرکے اردو والوں کو اپنی ذمے داری کا احساس دلایا ہے۔ اردو کی ترویج کے لیے جو موثر اقدامات اردوداں حضرات کی طرف سے کیے جاسکتے ہیں ان میں پہلا طریقہ جس پر عمل ہوسکتا ہے یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھانے لکھانے کی ضمانت لیں۔ اردو کے ادیبوں نے اسے صرف مسلم کلچر تک محدود کر رکھا ہے۔ وہ اپنے ذاتی مقاصد اور خودغرضی میں اردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی حفاظت کے لیے اردو کا وجود لازمی ہے۔

بجلی معلوماتی مضمون ہے۔ مضمون نگار نے اپنے تجربے کو بنیاد بنا کر یہ مضمون لکھا ہے۔ رشیدی نے وحشت کی شاعری پر مناسب روشنی ڈالی ہے۔ وحشت نے ماضی وحال کا جائزہ لیا اور اپنے آہنگ سے ایک نیا راستہ نکالا جس میں ماضی کی توانائی، حال کا شعور اور مستقبل کے امکانات پوشیدہ ہیں۔

نسیم احمد صاحب نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ زبان کسی سرحد میں مقید نہیں رہ سکتی، یہ وقت اور حالات کے لحاظ سے سفر کرتی ہے، اپنے نقوش دوسری زبانوں پر چھوڑتی ہے اور دوسری زبانوں کے اثرات خود بھی قبول کرلیتی ہے۔ مضمون ''تنقید کا منصب'' پسند آیا۔ تنقید کا بنیادی مقصد ادب کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ یہ قاری کو ادب شناسی کی راہ دکھاتی ہے، پڑھنے والوں کے ذہن کی تربیت کرتی ہے۔

سید احتشام حسین صاحب نے انقلابی ادیبوں سے تعارف کروایا، ان ادیبوں نے سیاسی جور کے ایام میں بھی لکھنا ترک نہیں کیا۔

انٹرنیٹ پر اردو زبان کا استعمال بڑھ رہا ہے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی، اسے سرکاری یا کارپوریٹ سرپرستی حاصل ہو ایسی ہماری دعا ہے۔

بیرونی ممالک میں جاکر تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طالب علم کو چودھری نوازش مہدی صاحب نے جو جانکاری دی ہے اس کے لیے وہ شکریے کے مستحق ہیں۔

''اردو خبرنامہ'' سے اردو کی موجودہ صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'تبصرہ وتعارف' اردو دنیا کا اہم گوشہ ہوتا ہے۔ شمیم احمد صدیقی کا مضمون 'انوکھے معمار' بچوں نے بے حد پسند کیا ہوگا۔

■ اشتیاق احمد دیو، صدر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اسٹوڈینٹس ایسوسیشن، ڈوڈہ، ضلع۔ ڈوڈہ، (جموں وکشمیر)

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا مطالعہ عرصۂ دراز سے مسلسل کر رہا ہوں۔ ڈوڈہ میں جی. آر. آزاد آئی. ٹی. سنٹر اور MANUU اسٹڈی سینٹر کے کوارڈینیٹر فردوس احمد ملک خود گھر گھر اس رسالے کو پہنچاتے ہیں۔ ''اردو دنیا'' کے مطالعے سے میری آنکھیں کھلی ہیں کہ اردو کتنی ترقی کرچکی ہے اور ترقی کی کن نئی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کی سب سے زیادہ پسماندہ ''وادی چناب'' جس کی آبادی ساڑھے آٹھ لاکھ کے قریب ہے اور یہ تین اضلاع ڈوڈہ، کشتواڑ، رام بن پر محیط ہے۔ اس پہاڑی وادی میں 95% لوگ اردو بولتے اور لکھتے ہیں یہاں کوئی سرکاری یا غیرسرکاری B.Ed کالج سوائے ایک غیرسرکاری کالج کے موجود نہیں ہے جبکہ جموں، سرینگر میں پچاسیوں کالج موجود ہیں۔ حال ہی میں MANUU نے ریاست جموں وکشمیر میں B.Ed کالج کھولے تو دونوں ریگولر کالج سرینگر میں اور فاصلاتی جموں توی میں قائم کیا ہے۔ حالانکہ جموں شہر میں فقط دس فیصدی طلبہ ہی اردو زبان لکھنا اور پڑھنا جانتے ہیں۔

ہم جناب وائس چانسلر صاحب MANUU سے بصد احترام گزارش کرتے ہیں کہ وادی چناب کے اس مرکزی وصدر مقام ڈوڈہ میں ایک B.Ed کالج قائم کیا جائے یہاں کے عوام آپ کو بھرپور تعاون دیں گے۔

■ شجاع الدین شاہد، کلاودیا مندر انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی پولیٹیکنک، ممبئی

پچھلے شمارے میں میرا مضمون ''ظفر سے گفتگو'' کی اشاعت کا شکریہ! قارئین کے کئی خطوط موصول ہوئے اس سے ''اردو دنیا'' کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ''اردو دنیا'' ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ میں اسے ایک تحریک تصور کرتا ہوں۔ عصر حاضر اور عصری تعلیم کی بھرپور عکاسی آپ کے اس رسالے میں نظر آتی ہے بے شک موجودہ نسل اس سے فیض یاب ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اردو کی ترویج و اشاعت میں ''اردو دنیا'' ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ آپ حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■ **ڈاکٹر نصیر الدین عمر، ایڈیٹر، ماہنامہ ''رختِ سفر'' مقام۔ چمن پور، کرماٹانڑ، ضلع۔ جامتاڑا، (جھارکھنڈ)**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' آپ کی ادارت میں مزید معتبر اور حسین تر ہوتا جا رہا ہے۔ حکومت کے ماتحت شائع ہونے والا ماہنامہ جتنا زیادہ رنگ و نور سے مزین ہو وہ کم ہے، لیکن اس کی باطنی خوبصورتی اور معیار کے اضافے میں یقیناً صرف اور صرف آپ کا ہاتھ ہے اس معاملے میں مجھے ماہنامہ ''رختِ سفر'' کے لیے جو تگ و دو کرنی پڑتی ہے وہ میں ہی محسوس کر سکتا ہوں۔

بہر حال مئی 2009 کا شمارہ دیکھا، کیریئر اور سائنسی معلومات پر مشتمل مضامین معیاری اور معلومات افزا ہیں لیکن بجلی پر مضمون میں کچھ اصطلاحات کی وضاحت ہو جاتی تو قارئین کی معلومات میں مزید اضافہ ہوتا۔

■ **سلطان احمد ساحل، نیو ڈی۔ ایس۔ کیپبل فلیٹ نمبر۔ 34، کیبل ٹاؤن، پوسٹ۔ گولموری، جمشید پور۔ 831003 (جھارکھنڈ)**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' روز افزوں ترقی کی طرف گامزن ہے۔ ''ہماری بات'' میں آپ ہمیں متواتر اپنی ذمہ داریوں کا احساس بڑے سلیقے کے ساتھ دلاتے رہتے ہیں۔ اردو دنیا کی تمام اہم خبریں، سرگرمیاں، زبان و تعلیم، ادب و سائنس وغیرہ پر موضوعاتی مضامین اپنے اندر معلومات کا خزانہ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اس کارگراں قدر میں محنت، لگن، حوصلہ اور صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسالہ دن بہ دن ترقی سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ اس کے لیے اس کی مجلس ادارت کے تمام لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

■ **محمد شاہد، مالیر کوٹلہ، پنجاب**

''اردو دنیا'' کا شمارہ مئی 2009 نظر نواز ہوا۔ اس رسالے کا ہر شمارہ اپنے وقیع مشمولات اور متنوع موضوعات کو محیط ہونے کے باعث انفرادیت کا حامل ہوتا ہے، زیر نظر شمارے میں شامل پروفیسر علی احمد فاطمی کا پراز معلومات مضمون خصوصی توجہ کا مستحق ہے، فاطمی صاحب کا دلکش انداز بیان اور رواں دواں اسلوب دامن دل کھینچتا ہے موصوف نے جس خوبی سے الٰہ آباد کے ادبی منظر نامے کا جائزہ لیا ہے اور مختصر سے مضمون میں جیسی بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں اس کی داد اہل نظر دیں گے۔ نسیم احمد نسیم کا مضمون بھی خوب ہے ڈاکٹر اشرف رفیع نے لغت مجتہدی کا بھرپور تعارف کرا کے اس لغت کے دیکھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا اشتیاق بڑھا دیا۔ یعقوب میراں مجتہدی کا یہ کارنامہ کسی ادارے کی مدد کے بغیر انجام پایا ہے اس لیے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

اس بار کا اداریہ فکر انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے اجارہ داروں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔

■ **حکیم غزالی انور ہلال سلفی، خادم طب اسلامی، دربھنگہ**

جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا کہ دربھنگہ ایک علمی شہر ہے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی وین اپنی پہلی فرصت میں دربھنگہ کا دورہ کرے، تاکہ اس شہر کے اہل علم حضرات کو پوری طرح استفادہ کرنے کا موقع مل سکے۔

■ **محمد رفیع الدین مجاہد، اکولہ، (مہاراشٹر)**

مئی 2009 کا اردو دنیا پڑھا۔ اردو دنیا کی شہرت و مقبولیت نے گویا ایوان اردو کو سنبھال رکھا ہے۔ معیار و مواد دیکھ کر تو مجھے یہی محسوس ہوتا ہے۔

رسالے میں یوں تو سبھی کچھ ہے۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ ہر ماہ ایک افسانہ اور طنز و مزاح پر مبنی مضمون بھی پڑھنے کو مل جایا کرے۔

محمد تقی جمیل نے پتھروں کو زبان دے کر علم میں خوب اضافہ کیا۔ وہیں انٹرنیٹ اور اردو، ای لرننگ اور بہادر شاہ ظفر والے سے بھی خوب استفادہ ہوا۔ خان قمر الزماں کیریئر گائڈنس پر بڑے اچھے مضامین لکھ رہے ہیں۔ یہ سلسلہ قائم رہنا چاہیے۔ اس سے قبل کے دو شماروں میں عبد الرحیم نشتر اور محمد سراج عظیم کی بچوں کے متعلق عمدہ نگارشات تھیں۔ اس بار شمیم احمد کا انوکھے معمار واقعی انوکھی معلومات ہے۔

■ **ڈاکٹر رضوانہ ارم، صدر شعبۂ اردو، جمشید پور ویمن کالج، جمشید پور، (جھارکھنڈ)**

اردو دنیا کا ہر شمارہ نئی آب و تاب کے ساتھ وقت کی ایک اہم ضرورت کی شکل میں ادب کے قاری کے سامنے آتا رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اور کیریئر کے عنوان سے ہر بار اردو کو روزگار سے جوڑنے کا ایک نیا پہلو ہوا کرتا ہے۔ اردو زبان کسی زبان سے کم تر نہیں بلکہ اس میں بھی کیریئر سے متعلق روشن مستقبل کے امکانات موجود ہیں۔

■ **امتیاز سرمد، 125، نرمدا ہاسٹل، جے۔ این۔ یو، نئی دہلی۔ 67**

مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اداریے کے وسیلے سے رالف رسل کے مضمون کے اقتباس میں جو اہم نکات پیش کیے گئے ہیں، وہ اردو زبان کو درپیش موجودہ مسائل سے نمٹنے میں کافی معاون ہو سکتے ہیں۔ وحشت کی غزل گوئی کے حوالے سے معید رشیدی کا مضمون بہت خوب ہے۔ موصوف نے وحشت کی غزل کا فنی محاکمہ بہت عمدگی کے ساتھ کیا ہے۔ عشق، تصوف اور سیاست جیسے موضوعات کے حوالے سے ان کی غزلیہ شاعری کو آنکنے کی کوشش خوب ہے۔ دیگر مشمولات میں تنقید کا منصب، پتھر بولتے ہیں اور انٹرنیٹ اور اردو اچھے لگے۔ رامسے کلارک کا انٹرویو معلوماتی ہے۔ رسالہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے پسند آیا۔

* * *

ہماری بات

ذہن کی تشکیل اور تعمیر میں تعلیم کی وہی اہمیت ہے جو کہ جسم کی پرورش میں خوراک کی، دنیا کا کوئی بھی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا جب تک کہ اس کے باشندے تعلیم کی برکتوں سے بہرہ ور نہ ہوں۔ اگر آج ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ تعلیم اور روزگار کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے تو ہمارا ملک بھی صحیح معنوں میں ترقی نہیں کرسکتا۔ سچر کمیٹی نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی جو تصویر پیش کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے معاملے میں مسلمان دوسرے سبھی مذہبی اور سماجی گروہوں سے پیچھے ہوگئے ہیں۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق 14-6 برس کی عمر کے مسلم بچوں میں سے ایک چوتھائی بچے ایسے ہیں جو یا تو کبھی اسکول ہی نہیں گئے یا ابتدا میں ہی انھوں نے اسکول چھوڑ دیا۔ پرائمری سطح کی تعلیم میں مسلم بچوں کے Dropout کی شرح دوسرے سبھی گروہوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح 17 سال سے زیادہ عمر کے مسلم طلبہ میں میٹرک کی سطح پر تعلیم مکمل کر پانے کی شرح 17 فیصد ہے جبکہ ملک گیر سطح پر یہ شرح 26 فیصد ہے۔ سچر کمیٹی کے مطابق اعلیٰ تعلیم کی سطح پر اس فاصلے میں بتدریج اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ گریجویشن تک کی تعلیم حاصل کرنے والے مسلم طلبہ کی تعداد دیگر مذہبی اور سماجی گروہوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے مقابلے میں کافی کم ہے۔ IITs اور IIMs جیسے اعلیٰ سطحی اداروں میں ان کی شرکت نہ کے برابر ہے۔ ان اداروں میں کرائے گئے ایک سروے کے مطابق گریجویشن کی تعلیم حاصل کر رہے 25 طلبہ میں سے صرف ایک طالب علم مسلم ہے۔ پوسٹ گریجویشن کی سطح پر یہ صورت حال اور بھی بدتر ہو جاتی ہے جہاں 50 طلبہ میں صرف ایک ہی مسلم ہے۔ یعنی ان اداروں میں مسلم طلبہ کی گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کی سطح پر شرکت کی شرح بالترتیب 4 فیصد اور 2 فیصد ہے۔ اس صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے سچر کمیٹی نے Affirmative Actions کی ضرورت پر زور دیا ہے اور اس ضمن میں سفارشات بھی پیش کی ہیں۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ حکومت ہند اور خاص طور پر وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے اس تعلق سے جو اقدامات کیے ہیں ان سے صورت حال میں تبدیلی نظر آرہی ہے۔ حکومت کی عمل درآمد رپورٹ کے مطابق پرائمری اور اعلیٰ پرائمری سطح پر مسلم بچوں کے داخلے کی شرح جو 07-2006 میں بالترتیب 9.4 فیصد اور 7.5 فیصد تھی 08-2007 میں بڑھ کر 10.54 فیصد اور 8.54 فیصد ہوگئی۔ ایسے مسلم بچے جنھوں نے اسکول میں کبھی داخلہ نہیں لیا تھا ان کی تعداد 2005 میں 21 لاکھ تھی جبکہ 2008 میں وہ گھٹ کر 9.4 لاکھ ہوگئی۔ کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیوں میں مسلم لڑکیوں کی داخلے کی شرح میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیوں میں ہونے والے کل داخلوں میں سے 6.70 فیصد داخلے مسلم لڑکیوں کے ہوئے ہیں جس کی اہم وجہ مسلم اکثریتی علاقوں میں ان اسکولوں کو ترجیحی طور پر کھولا جانا ہے۔ 2004 سے آج تک 2573 کستوربا گاندھی ودیالیوں کو منظوری دی گئی ہے جن میں 427 کا تعلق مسلم اکثریت والے علاقوں سے ہے۔ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے نومنتخب وزیر جناب کپل سبل نے سچر کمیٹی کی سفارشات کے نفاذ کے سلسلے میں جن عزائم کا اظہار کیا ہے اس سے اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے عمل کو مزید تقویت ملی ہے۔ سچر کمیٹی کی سفارشات سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ 30 مئی کو حلف لینے کے فوراً بعد انھوں نے کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد سے متعلق رپورٹ طلب کی۔ انھوں نے اپنے بیان میں مسلم بچوں خاص طور پر لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم میں شرکت بڑھانے کے لیے قومی سطح پر مہم چلانے اور مسلم اکثریتی علاقوں میں کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیوں کی تعداد میں مزید اضافہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ذریعے چلائے جارہے پروگرام پر نظر ثانی کے لیے یکم جون کو ہوئی میٹنگ میں جناب کپل سبل نے تعلیمی شعبے میں سچر کمیٹی کی سفارشات کے نفاذ کو یقینی بنانے کے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے ایک ایسا لائحہ عمل وضع کرنے کی ضرورت پر زور دیا جس میں مسلم لڑکیوں کی تعلیم اور اساتذہ کی ٹریننگ پر خصوصی توجہ دی گئی ہو۔ حکومت کے آئندہ کے پروگراموں کی نشاندہی کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا کہ اقلیتوں کی بہبود کے لیے 15 فیصد وسائل کا استعمال، تمام ریاستوں میں ہنرمندی کے فروغ سے متعلق اسکیموں کا نفاذ اور یو.جی.سی کے امتحانات کے لیے ریمیڈیل کوچنگ جیسی اسکیموں کو بروئے کار لانا ان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کارکردگی اور اردو زبان کے فروغ میں اس کے مثبت کردار پر اطمینان کا اظہار کیا اور یہ واضح کیا کہ کونسل کے دائرۂ کار کی وسعت، وزارت کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔

جناب کپل سبل کے مطابق ملک کے تعلیمی نظام میں تبدیلی وقت اور حالات کا تقاضہ ہے۔ بے روزگاری ہندوستان کا ایک اہم مسئلہ ہے اور تعلیم اور روزگار کے مابین گہرا تعلق ہے۔ کم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ افراد کے لیے روزگار کے وسائل محدود ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ بے حد ضروری ہو جاتا ہے کہ تعلیم گھر گھر پہنچے جس سے ملک کا ہر باشندہ فیض یاب ہو سکے۔

وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کا لائحہ عمل اس طرح وضع کیا جارہا ہے کہ موجودہ وسائل کو حسب ضرورت مساوری طور پر تقسیم کیا جاسکے۔ جناب کپل سبل کی آمد سے نہ صرف وزارت میں ایک نئی سرگرمی دیکھنے میں آرہی ہے بلکہ تعلیم کے شعبے سے وابستہ ہر شخص پر امید نظر آرہا ہے۔

□□□

عبدالعلیم قدوائی

ہندوستان میں ابتدائی یا پرائمری تعلیم

(2006-2007)

ہمارے دستور میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ملک کے تمام بچوں کو 14 سال کی عمر تک لازمی مفت تعلیم دی جائے گی۔ اس کے پیش نظر حکومت ہند نے یہ نشانہ مقرر کیا کہ 2010 تک سارے ملک میں پرائمری یا بنیادی تعلیم کا معقول انتظام کردیا جائے گا اور اس کے لیے مختلف پروگرام شروع کیے جن میں سرفہرست سروشکشا ابھیان عام تعلیم کی مہم ہے جو 2001 میں شروع کیا گیا۔ ایسے عظیم پروگرام کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں ایک منظم اور چاق و چوبند اطلاعاتی و معلوماتی نظام قائم کیا جائے اور ہر مرحلہ پر تعلیمی پروگرام کی جانچ پڑتال اور نگرانی کی جائے تاکہ اس کے خاطرخواہ مثبت نتیجے نکلیں اور ملک میں اعتماد اور کامیابی کیا لہر دوڑ جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں تعلیم کا معلوماتی نظام بڑی خوش اسلوبی سے حکومت ہند کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے تحت چل رہا ہے جس میں ریاستی اور مرکزی علاقوں کی حکومتیں پورے طور پر تعاون کررہی ہیں اور متعدد سرکاری محکمے اور نیم سرکاری ادارے سرگرم عمل ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک نیشنل یونیورسٹی آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن قائم کی گئی ہے۔ جو ملک کی تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں چل رہے پرائمری اسکولوں کی کارکردگی کے بارے میں ہر سال بڑی مفصل اور جامع رپورٹ شائع کرتی ہے جس سے ملک کی تعلیمی ترقی کا اندازہ ہوتا رہتا ہے اور تجربات کی روشنی میں مناسب اصلاحی اور تعمیری قدم اٹھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مختصر مضمون میں 2007-2006 کی رپورٹ کی تلخیص پیش کی جارہی ہے۔

اس رپورٹ میں تقریباً بارہ لاکھ پرائمری اسکولوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو ملک کی 33 ریاستوں کے 609 اضلاع میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لیے ریاستی حکومتوں اور تجزیہ کار معلومات اکٹھا کرنے والے افراد اور اداروں کا پورا تعاون اور اشتراک ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے ضلعی سطح پر ایک انفارمیشن یا معلوماتی سسٹم کی تشکیل کی ہے جس میں ہر اسکول کے متعلق مفصل معلومات کارڈوں پر جمع کی جاتی ہے۔ جس میں طلبہ و اساتذہ کی تعداد، اسکولوں کی حالت، تعلیمی سہولیات اور دشواریوں وغیرہ کے مستند اعداد و شمار ہوتے ہیں جن کی مدد سے تعلیمی ترقی اور اسکولوں کو بہتر بنانے کا کام کیا جاسکتا ہے۔ ہر سال اعداد و شمار معلومات میں نئی جہتوں کا اضافہ کیا جاتا ہے مثلاً اس سال پہلی دفعہ مسلمہ طلبہ کے داخلوں اور تعلیمی ترقی کے بارے میں اعداد جمع کیے گئے ہیں نیز معذور اور پچھڑی ذاتوں اور قبیلوں کے بچوں کی تعداد بھی الگ بتائی گئی ہے۔ ان اعداد و شمار کی جانچ اور تصدیق کے لیے ذمے دار اداروں کی مدد لی جاتی ہے جو ان کو بہتر اور مستند بنانے کے لیے مختلف مشورے دیتے رہتے ہیں۔ اعداد و شمار گاؤں، بلاک، ضلع، ریاست کے پرائمری اسکولوں کے بارے میں ہوتے ہیں جو حکومت ہند کو بھیجے جاتے ہیں اور انھی کی بنیاد پر ہر سال رپورٹ شائع کی جاتی ہے۔ اس پروگرام کے لیے مالی امداد اقوام متحدہ کا ادارہ یونیسیف فراہم کرتا ہے۔

2007-2006 میں 609 اضلاع کے پرائمری اسکولوں کے متعلق اعداد و شمار جمع کیے گئے ہیں جن میں ہر ریاست میں اضلاع، گاؤں، اسکولوں، طلبہ اور اساتذہ کی تعداد دی گئی ہے۔ جو دوسرے صفحے پر دیے گئے جدول میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس وقت ملک کے طول و عرض میں 1196663 پرائمری یا بنیادی تعلیم دینے والے اسکول چل رہے ہیں جن میں سے 87.5 فی صد اسکول دیہی علاقوں میں چل رہے ہیں۔ 2003-2002 میں ان اسکولوں کی تعداد 853601 تھی۔ ان میں سے 65.14 فی صد اسکول ایسے ہیں جہاں صرف پرائمری درجوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اپر پرائمری اسکولوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ملک میں 225635 پرائمری اسکول پرائیویٹ اداروں کے زیر اہتمام چل رہے ہیں جن میں سے 90 فیصد اسکولوں کو سرکاری امداد دی جارہی ہے۔

اچھی تعلیم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اسکول کی عمارت پختہ اور وسیع ہو۔ اس وقت ملک کے 70 فیصد پرائمری اسکول پکی عمارتوں میں کام کررہے ہیں۔ دس فیصدی اسکولوں کے پاس کوئی عمارت نہیں اور وہ ایک دو کمروں، شکستہ کچی عمارتوں یا کھلے میدان میں چل رہے ہیں۔ باقی نیم پختہ یا کچے مکانوں میں قائم ہیں۔ اسکولوں کی تعداد کے ساتھ طلبہ کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے چنانچہ اس وقت سترہ کروڑ ترانوے لاکھ بیالیس ہزار آٹھ سو سترہ طلبہ کے نام پرائمری اسکولوں میں لکھے ہوئے ہیں جب کہ 2003-2002 میں یہ تعداد بارہ کروڑ چھیالیس لاکھ تھی۔ لڑکیوں کا تناسب 47.79 سے بڑھ کر 48.09 فی

ہندوستان میں پرائمری اسکولوں کی حالت 2006-2007 میں

نمبر شمار	نام ریاست	تعداد اضلاع	گاؤں کی تعداد	پرائمری اسکولوں کی تعداد	طلبہ کی تعداد	اساتذہ کی تعداد
1.	انڈمان نکوبار	3	196	350	52426	3521
2.	آندھرا پردیش	23	25666	100932	11306819	511579
3.	اروناچل پردیش	16	2753	3412	276457	12829
4.	آسام	23	22037	63996	5422711	221047
5.	بہار	37	32471	54889	15120547	237449
6.	چنڈی گڑھ	1	20	178	125123	5353
7.	چھتیس گڑھ	16	22298	48968	4195222	155652
8.	دادرا نگر حویلی	1	70	276	46699	1038
9.	دہلی	9	413	4742	2344914	93657
10.	گوا	2	626	1420	164963	6854
11.	گجرات	25	19615	38472	7540861	216564
12.	ہریانہ	20	7603	16180	2492009	78157
13.	ہماچل پردیش	12	9995	16614	1081599	59143
14.	جموں کشمیر	14	6985	20711	1628930	101959
15.	جھارکھنڈ	22	28480	40618	6355016	131646
16.	کرناٹک	27	27473	55364	7889506	249971
17.	کیرالا	14	1921	12183	3401987	127672
18.	لکش دیپ	1	10	30	8082	417
19.	مدھیہ پردیش	48	53958	125858	15182309	398744
20.	مہاراشٹر	35	42728	86429	15342625	552369
21.	منی پور	9	2117	3869	462190	22650
22.	میگھالیہ	7	5433	9268	539515	29873
23.	میزورم	8	813	2782	226923	16025
24.	ناگالینڈ	8	1276	2537	471439	21075
25.	اڑیسہ	30	34922	51198	4927827	150692
26.	پانڈیچری	4	365	668	179739	7612
27.	پنجاب	19	12773	20950	2702272	85118
28.	راجستھان	32	37767	100965	12462231	396930
29.	سکم	4	855	1226	121995	9779
30.	تامل ناڈو	30	19273	52423	9776589	360463
31.	تریپورہ	4	951	3679	697525	31013
32.	اتر پردیش	70	90804	168969	32162514	608638
33.	اترا کھنڈ	13	11489	19161	1269903	49326
34.	بنگال	20	38612	67265	13342492	263126
	میزان	609	562809	1196663	179342817	5218578

صد ہوگیا ہے۔ اس سال پہلی دفعہ مسلم طلبہ کی مردم شماری کی گئی جس سے پتہ چلا کہ ان کی تعداد کل طلبہ کا 9.39 فی صد یعنی دس فیصدی سے بھی کم ہے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال افسوس ناک اور ہم سب کے لیے قابل توجہ ہے۔

اعداد و شمار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پرائمری اسکولوں کے طلبہ میں مسلمانوں کا تناسب جموں اور کشمیر میں 66.52 فیصد، آسام میں 30.42 فیصد، بنگال میں 2792، کرناٹک میں 13.54، کیرالا میں 10.13، آندھرا میں 10 فیصد اور اتر پردیش میں 9.24 فیصد رہا اور دوسری ریاستوں میں اس سے بھی کم، اس لیے ملک کا اوسط پرائمری درجوں (I سے لے کر V تک) 9.39 اور اپر پرائمری ملا کر یعنی X سے VII کے 8.89 رہا۔ چونکہ یہ اعداد و شمار پہلی دفعہ اکٹھا کیے گئے ہیں اس لیے ان کی صحت پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے پھر بھی صورت حال اطمینان بخش نہیں کہی جا سکتی۔ ملک کے 40 اضلاع میں پرائمری درجوں میں مسلم طلبہ کی تعداد 25 فی صدی یا اس سے کچھ زیادہ پائی گئی۔ ضرورت ہے کہ مسلم اقلیت کے دانشور، سماجی کارکن بلکہ سب ہی افراد اس کی طرف توجہ کریں کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان بچے پرائمری اسکولوں میں داخل ہوں اور تعلیمی میدان میں پیش رفت کریں۔ دوسری پچھڑی ذاتوں کے طلبہ کا تناسب ان اسکولوں میں 49.33 فیصد پایا گیا۔ اس سال پرائمری اسکولوں میں دستور میں درج شدہ ذاتوں اور قبیلوں کے طلبہ کی تعداد و تناسب میں بڑا اضافہ ہوا۔

ہمارے ملک میں پرائمری تعلیم کا ایک المیہ یہ رہا ہے کہ بہت سے طلبہ پرائمری کورس درجہ پنجم پاس کرنے سے پہلے ہی تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر اس رپورٹ سے یہ خوش آئند اطلاع ملی ہے کہ 2006-2007 میں 70 فیصد طلبہ پابندی سے درجوں میں حاضر ہوتے رہے بلکہ تمل ناڈو کرناٹک اور کیرالا میں تو حاضری 90 فیصد کے لگ بھگ رہی۔ ہمارے تعلیمی منتظمین کی کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ بچے پرائمری تعلیم پوری کر کے آگے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں۔

ابتدائی تعلیم کے فروغ اور کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اسکول کی عمارتیں پکی اور طلبہ کی تعداد کے مطابق ہوں تا کہ درجوں میں زیادہ بھیڑ نہ ہونے پائے۔ پینے کے پانی اور بیت الخلا کا تشفی بخش انتظام ہو۔ دوپہر کے کھانے کا معقول نظم ہو اور اچھے اساتذہ وافر تعداد میں ہر اسکول میں موجود ہوں۔ ان کی ٹریننگ اور تربیت کا خصوصی انتظام ہو تا کہ تعلیمی نظام کامیابی سے چلتا رہے۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ خواتین ٹیچروں کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے اسکول کا ماحول بہتر ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی ان اسکولوں میں کمپیوٹر، اپر پرائمری درجوں کے انتظام کی بھی ضرورت ہے۔

اس رپورٹ کے مطالعے سے ہم کو مندرجہ ذیل باتوں کا علم ہوتا ہے۔

1. اسکولوں کی اپنی پختہ عمارتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت ملک میں 40 طلبہ کے لیے ایک کمرہ کا اوسط تناسب پایا جاتا ہے۔ بہار، جھارکھنڈ اور اتر پردیش میں ایک درجہ میں 50 سے لے کر 90 طالب علموں کو بیٹھنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

2. 29% پرائمری اسکولوں میں دوپہر کا کھانا پکانے کے لیے اپنے باورچی خانے موجود ہیں۔ 85% اسکولوں میں پینے کے پانی کا مناسب انتظام ہے۔ 50% اسکولوں میں ہینڈ پمپ لگے ہوئے ہیں۔ 58% اسکولوں میں مشترک بیت الخلا اور 42% اسکولوں میں لڑکیوں کے لیے الگ بیت الخلا موجود ہیں۔

3. اس وقت ملک کے پرائمری اسکولوں میں تقریباً 12 لاکھ طلبہ پڑھ رہے ہیں جن میں 48.01 فی صد لڑکیاں، 9.39 فیصد مسلمان طلبہ، 20.11 فیصد، دستوری درج ذاتوں کے اور 11.36 فیصد شیڈولڈ قبیلوں کے طلبہ ہیں۔

4. رپورٹ میں اس بات پر اطمینان ظاہر کیا گیا ہے کہ 70 فیصد طلبہ پرائمری اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد آگے بڑھ رہے ہیں اسکولوں کے معیار اور نتائج بھی بہتر ہوئے ہیں چنانچہ اس سال 45.12 فیصد لڑکیوں اور 44.96 فیصد لڑکیوں نے چوتھے پانچویں درجوں میں 60 فیصد یا اس سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔

5. اس وقت ان اسکولوں میں تقریباً باون لاکھ اساتذہ پڑھا رہے ہیں اور ہر اسکول میں کم سے کم دو استاد موجود ہیں۔ ظاہر ہے طلبہ کی تعداد دیکھتے ہوئے استادوں کا تناسب بہت کم ہے اور سرکار اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ضروری قدم اٹھا رہی ہے۔ حال میں ان اساتذہ کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ سڑکوں اور روشنی کی سہولتوں کی طرف ریاستی حکومتیں زیادہ توجہ دے رہی ہیں۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دہلی، پانڈیچری کیرالا، تمل ناڈو اور چنڈی گڑھ میں پرائمری تعلیم کی اچھی ترقی ہوئی ہے۔ خاص کر کیرالا جو سرفہرست ہے پھر بھی ضرورت ہے کہ یہ ریاستیں پرائمری اسکولوں کو اور زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کریں اور وہاں اور زیادہ سہولتیں دیں۔

رپورٹ نے بجا طور پر تمام ریاستوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے بجٹ اور وسائل میں پرائمری تعلیم کو خاص اہمیت دیں تا کہ ہم دستوری ضمانت اور قومی ذمے داری کو پورا کر سکیں۔ سماج کے سبھی طبقوں کو اس اہم کام میں حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیے اور ملک کے بچوں کا مستقبل خوش آئند اور تابناک بنانا چاہیے۔

ہماری نیشنل یونیورسٹی کا قابل تعریف کارنامہ ہے کہ اس نے 12 لاکھ اسکولوں کے مفصل کارڈ تیار کروائے ہیں جن کی مدد سے پرائمری تعلیم اور پرائمری اسکولوں کی تعلیمی صلاحیت و کارکردگی میں اضافہ ہوگا نیز مزید تحقیق اور علمی استفادہ کے مواقع ملیں گے۔

□□□

Zahida Manzil, Aligarh-202002 (U.P.)

حلیمہ فردوس

ریاستِ کرناٹک میں اُردو ذریعۂ تعلیم

دستورِ ہند کی رو سے ملک کی دیگر زبانوں کی طرح زبان اردو کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ مگر صنعتی انقلاب اور عالم کاری کی وجہ سے دنیا کی بہت سی زبانیں آج کسمپرسی کا شکار ہیں۔ اردو بھی اس طوفان کی زد میں آگئی ہے۔ ویسے بھی ماہرین لسانیات نے عالمی سطح پر بیسویں صدی کو زبانوں کے زوال کی صدی قرار دیا ہے۔ اس پُر آشوب ماحول میں اردو زبان کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے دور حاضر کے منظر نامے پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ جس طرح مذہب کی روح کو سمجھے بغیر اپنے ظاہری رویے سے ہم مطمئن ہو جاتے ہیں اسی طرح اردو زبان کے حق میں کوئی سنجیدہ نظریہ قائم کرنے یا عملی قدم اٹھانے کی بجائے ہم اس کے زوال پر سینہ کوبی کرنے لگتے ہیں۔ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے سب سے پہلے ہمیں اپنا یہ رویہ بدلنا ہوگا۔

آج اردو کی بقا کے لیے محض بیان بازی یا جذباتی نعروں کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک کیا جاتا رہے گا۔ آج اردو والے شکوک وشبہات کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایک طبقہ مذہبی سرمائے کو بچانے کی فکر میں اردو کی تعلیم کی حمایت کرتا ہے تو دوسرا طبقہ اس زبان کے گنگا جمنی مزاج کے گن گاتے ہوئے اردو کو مسلمانوں تک محدود رکھنے کو ایک سازش قرار دیتا ہے۔ ایک گروہ ماہرین تعلیم کے اس خیال کی بھر پور تائید کرتا ہے کہ بچے کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہی ہونی چاہیے۔ متوسط طبقے کے افراد جو زمانے سے پیچھے رہ جانے کے خوف میں مبتلا ہیں اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم سے پڑھانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی مادری زبان اردو کو بحیثیت تیسری زبان پڑھانے کے خواہشمند ہیں۔ اردو کا کوئی علاقہ یا کوئی ریاست نہیں ہے وہ اپنے ہی ملک میں بے گھر ہے اس کے باوجود اس سخت جان میں حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہے۔

ریاست کرناٹک میں اردو تعلیم پر اظہار خیال کرنے سے قبل ملک گیر سطح پر اردو بولنے والی آبادی کی معاشی اور تعلیمی صورت حال سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ آج تعلیم سب کے لیے یعنی ''سروشکشا ابھیان'' جیسی مہم کے باوجود پانچ سے چودہ (5-14) سال تک کی عمر کے ہر بچے کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا خواب پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ تقریباً تین سو ملین افراد اپنا نام بھی پڑھنا نہیں جانتے اور ایک سو ستر ملین طلبہ ذہانت اور شوق کے باوجود غریبی کی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے۔ پرائمری اور سکینڈری تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد 1.2 ملین ہے۔ جبکہ 1.1 ملین بچے ہی ہائر ایجوکیشن کی سطح تک پہنچ پاتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت مزید تشویشناک ہے، ابتدائی تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد 33 فیصد ہے۔ ثانوی درجوں میں یہ شرح گھٹ کر 24 فیصد رہ جاتی ہے اور اعلیٰ تعلیم میں یہ شرح 20 فیصد رہ جاتی ہے۔ ہمارے ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو بولنے والوں کا تناسب علاحدہ علاحدہ ہے۔ 2001 کی مردم شماری لسانی رپورٹ کے مطابق ملک کے پانچ کروڑ پندرہ لاکھ چھتیس ہزار لوگوں کی مادری زبان اردو ہے۔ جس کی 80 فیصد پسماندہ آبادی تعلیم سے محروم ہے۔ نوے کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں خواندگی کے اعتبار سے صرف یہی وہ طبقہ ہے جو سرکاری مراعات کی کشش کی وجہ سے اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر راغب ہوتا ہے۔ خام خیال انگریزی ذریعۂ تعلیم کو ہر مشکل کا حل سمجھتی ہے۔ قومی یونیورسٹی برائے تعلیمی منصوبہ بندی کی حالیہ رپورٹ کے مطابق 2005-06 میں جنوبی ہندوستان میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کے رجحان میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ خصوصاً تملناڈو اور آندھرا پردیش میں تامل اور تیلگو کے جنوبی بھی اپنی زبان سے بے وفائی کرنے پر اتر آئے ہیں۔ جبکہ کرناٹک وہ واحد ریاست ہے، جہاں انگریزی اسکولوں میں داخلے کی شرح گھٹ گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سال 2005-06 کے دوران مجموعی اعتبار سے داخلوں میں 9.6 لاکھ طلبہ کی کمی آئی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ایک قابل اطمینان بات یہ ہے کہ ملک گیر سطح پر اردو اسکولوں میں داخلے کی شرح میں ایک فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ ایسے میں ہمارے اساتذہ پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ان کو عام دھارے میں شامل ہونے کے قابل بنائیں۔ دراصل اردو اساتذہ کے لیے تدریس سب سے بڑا چیلنج بن گئی ہے۔ کبھی تعلیم لوہے کے چنے چبانے کا عمل ہوا کرتی تھی اور یہ فریضہ طلبہ ادا کرتے تھے لیکن مختلف چیلنجوں کی وجہ سے آج تدریس لوہے کے چنے چبانے کا عمل بن گئی ہے۔ ’سروشکشا ابھیان‘ کی وجہ سے اسکولوں کا جال بچھ گیا ہے، مختلف مراعات کی وجہ سے اسکولوں میں داخلے کی شرح میں اضافہ ہوا ہے مگر معیاری تعلیم عنقا ہوگئی ہے۔ ایسے میں کامیاب طلبہ کا تناسب زیادہ ہوگیا ہے اور باصلاحیت طلبہ کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ ایک غیر سرکاری تنظیم (N.G.O.) ’پرتھم‘ کی جانب سے سن 2007 میں پیش کی گئی رپورٹ سے پرائمری سطح کے طلبہ کی اکتسابی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ تیسری تا

پانچویں جماعت میں سے 66 فیصد طلبہ صرف اپنی مادری زبان پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ 60 فیصد طلبہ ریاضی کی بنیادی صلاحیت یعنی جمع اور تفریق سے واقف ہوتے ہیں، صرف 17 فیصد طلبہ درجۂ اول کا انگریزی نصاب پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی سروے اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں کا کیا جائے تو یہ شرح مزید گھٹ جائے گی۔

ریاست کرناٹک میں پرائمری، ہائر پرائمری اور ہائی اسکول کی سطح پر کنڑا ذریعۂ تعلیم اسکولوں کی تعداد 79.44 ہے جبکہ انگریزی اسکولوں کی تعداد 11.78 فیصد ہے۔ تیسرے درجے پر اردو زبان کے اسکولوں کا شمار ہوتا ہے۔ پرائمری سطح کے 7.46 فیصد ہائر پرائمری سطح کے 6.18 فیصد اور ہائی اسکول کی سطح کے 2.83 فیصد اردو اسکول قائم ہیں۔ یعنی اردو اسکولوں کی کل تعداد 5.44 فیصد ہے 'سرو شکشا ابھیان' کی حالیہ رپورٹ کے مطابق پہلی سے آٹھویں جماعت تک کے کل 3932 سرکاری اردو میڈیم اسکول ہیں، جن میں تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد 390315 ہے۔ جن میں لڑکوں کی تعداد 55,384 ہے اور لڑکیوں کی تعداد 2.34,931 ہے۔ جہاں تک اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ کی تعداد کا سوال ہے ان اعداد وشمار سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سرکاری یا امدادی اسکولوں میں لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس سے جنسی تفریق کا رجحان بالکل واضح طور پر نظر آتا ہے۔ یعنی والدین لڑکیوں کی تعلیم پر پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ سرکاری اسکولوں میں مفت یونیفارم اور کتابوں کی فراہمی، کھانے کی سہولت کی وجہ سے وہ انھیں پرائیویٹ اسکولوں کی بجائے سرکاری اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔ دراصل یہ معاملہ "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے" کے مصداق ہے۔ امدادی اسکولوں کی صورت حال بھی تقریباً یہی ہے۔ کل 615 امدادی اردو میڈیم اسکولوں میں پہلی تا آٹھویں جماعت میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد 47767 ہے، جن میں 29,246 لڑکیاں اور 18,521 لڑکے شامل ہیں۔ کیونکہ امدادی اردو اسکولوں کی فیس بہ نسبت انگریزی میڈیم اسکولوں کے کم ہوتی ہے اس لیے ان اسکولوں میں بھی لڑکیوں کی شرح زیادہ ہے، والدین لڑکوں کو انگریزی میڈیم میں تعلیم دلانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

اگر ہم طلبہ کے اعداد وشمار سے ہٹ کر اضلاع کی سطح پر اردو اسکولوں کی تعداد کا جائزہ لیں تو اس خیال کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اردو ایک پچھڑے ہوئے طبقے کی زبان بنتی جارہی ہے۔ شمالی کرناٹک کے اضلاع بیدر، گلبرگہ، بیجاپور اور ہاویری میں بے شمار اردو اسکول موجود ہیں، ان میں طلبہ کی کثیر تعداد بھی ہے، حیران کن بات یہ ہے کہ چھوٹے سے ضلعے ہاویری کے اردو میڈیم اسکولوں میں ریاستی سطح پر طلبہ کی تعداد سب سے زیادہ ہے، یہ ضلع معاشی سطح پر ریاست کرناٹک کا ایک کمزور علاقہ مانا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم پانے والے طلبہ کی ایسی انوکھی مثالیں بھی ملتی ہیں جو ہمارا کارگ حمیت پر تازیانے کا کام کرتی ہیں۔ انگریزی اسکولوں میں داخلے کی سہولت کے باوجود الحسنات اردو میڈیم اسکول ہانگل کے دو معصوم طالب علم پلپا اور سد لنگیا کی اردو زبان سے محبت قابل تعریف ہے۔ دونوں بھائیوں کا کہنا ہے کہ "مختلف مضامین کو اردو میں پڑھتے ہوئے ہمیں خوشی محسوس ہوتی ہے" ایسے میں ہمیں یہ قبول کر لینا چاہیے کہ اردو کی زبوں حالی کے ذمہ دار کوئی اور نہیں بلکہ اردو والے ہی ہیں۔ اردو زبان جو صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں پلی بڑھی اور شاہی محلوں میں جوان ہوئی جسے مفاد پرست انگریزوں کی حمایت بھی نصیب ہوئی، کسی دور میں جس کے شیدائیوں کی کمی نہیں رہی اس کے چاہنے والوں نے اس کی انگلی تھام کر اسے جنگلی جھونپڑی میں پہنچا دیا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں پلنے والے غریب اور معصوم بچوں سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرنا دانشمندی نہیں ہے البتہ ان کی مختلف صلاحیتوں کو فروغ دینا اساتذہ کی ذمے داری ہے۔ تعلیم میں کمزوری کی ذاتی تحریک کی کمی ہوا کرتی ہے۔ اور یہ تحریک والدین سے زیادہ فرض شناس اور دردمند دل رکھنے والے اساتذہ سے حاصل ہوسکتی ہے۔

ریاست کے مدور تعلقہ کے ایک چھوٹے سے قصبے ہوساہلی کا کنڑا میڈیم اسکول دیگر اسکولوں کے لیے ایک ماڈل بنا گیا ہے۔ ایک فرض شناس استاد کی محنت شاقہ کی وجہ سے یہاں کی دیواریں سائنس، سماجی سائنس کے مختلف موضوعات کے چارٹ سے مزین ہیں اور بچوں کی مدد سے سینچا ہوا ہرا بھرا باغیچہ سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اردو اسکولوں کے جس قدر مسائل ہیں اسی قدر سہولتیں بھی انھیں مہیا ہیں، ریاستی سرکار ممکنہ حد تک اسکولوں کو بنیادی سہولتیں جیسے بیت الخلا، بجلی، کھیل کا میدان، لائبریری اور پینے کے پانی کی سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ ممکن ہے یہ ساری سہولتیں ہر اردو اسکول کو مہیا نہ ہوں لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سلسلے میں اردو اسکولوں کو بالکل نظر انداز کیا جارہا ہے۔ 'سرو شکشا ابھیان' کی جانب سے اردو اسکولوں کے علاوہ عربی مدارس کو بھی قومی دھارے میں شامل کرنے کی غرض سے مختلف سہولتیں دی جارہی ہیں حتی کہ انگریزی، ریاضی اور سائنسی مضامین کی تدریس کے لیے سرکاری اساتذہ کو مدارس میں Depute کیا جارہا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی کے تدریسی طریقۂ کار کو اپنانے کے لیے تدریسی وسائل کی فراہمی، اسکول گرانٹ، ٹیچرس گرانٹس اور چنار نگلا پروگرام کے تحت اسکول ترک کرنے والے بچوں کو تعلیم کی جانب راغب کرنے کے لیے فی کس 2000 روپئے سالانہ وظیفہ 'سرو شکشا ابھیان' کی جانب سے دیا جاتا ہے۔ مختلف مدوں میں خرچ کی جانے والی رقم ایس. ایس. اے (S.S.A.) سے براہ راست ڈی. ڈی. پی. آئی کو بھیجی جاتی ہے اور یہ رقم اس محکمے سے اسکول کے

ایس. ڈی. ایم. سی اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہے۔ S.S.A کے افسران کی یہ شکایت ہے کہ بیشتر اردو اسکولوں کے سربراہان کی غیر ذمہ داری یا سرد مہری کی وجہ سے یہ رقم تین چار سال تک اکاؤنٹ میں یوں ہی پڑی رہتی ہے۔ ٹیچنگ ایڈس اور چارٹس وغیرہ کی تیاری کے لیے اساتذہ کو دی جانے والی سالانہ 500 روپے کی رقم عموماً صحیح طریقے پر خرچ نہیں ہوتی۔ بعض تن آسان اساتذہ اس رقم سے بچوں کی صلاحیتوں کے فروغ کا سامان مہیا کرنے کے بجائے ان کے زبان کے چٹخارے پر خرچ کر دیتے ہیں۔ آج نصابی کتابوں کے علاوہ مختلف سرگرمیوں پر مبنی تدریس کی کافی اہمیت ہے۔ D.S.E.R.T کی جانب سے اردو میڈیم اسکول کے بچوں کے لیے کئی ریڈیو اسباق تیار کر کے نشر کیے گئے ہیں، نلی کلی، ہنسی خوشی سیکھیں جیسے پروگرام بھی SSA کی جانب سے فراہم کیے جاتے ہیں۔ آئے دن مختلف پروگراموں کی تشہیر تو ہوتی رہتی ہے اس کے باوجود اردو اسکولوں کے ذمے دار اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ البتہ اردو ذریعۂ تعلیم والے بچوں کے لیے آنگن واڑیوں کی سہولت نہیں ہے۔ مسلم علاقوں میں اس کی کمی بری طرح محسوس کی جارہی ہے۔ نرسری سطح کے اسکولوں کے لیے کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے تین چار سال قبل کنڑ ا زبان کے خطوط پر نرسری نصاب تیار کیا گیا تھا لیکن اس کی اشاعت کا ہنوز عمل میں نہیں آیا۔ انگریزی میڈیم کے اسکولوں میں اردو بحیثیت تیسری زبان کی درسی کتابیں بھی تیار کی گئیں ہیں لیکن کتابوں کی کھپت نہ ہونے کی وجہ سے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ کرناٹک اقلیتی کمیشن کی تیار کردہ ڈائرکٹری میں 329 مسلم غیر سرکاری اداروں کے نام درج ہیں۔ بیشتر ادارے بنیادی تعلیم اور پرائمری تعلیم کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ دراصل اردو کی ترقی کا کام کسی ایک ادارے، انجمن کا کام نہیں ہے، بلکہ ہر فرد کو اس مشن سے جڑ جانا چاہیے۔

□□□

پتہ:
Head Depptt. of Urdu,
Govt. R.C. Commerce Collge,
Bengalore, Karnataka

کلّیات ولی

مرتب: نور الحسن ہاشمی

اردو شاعری کو ایک سمت عطا کرنے والے شیخ محمد ولی (ولی دکنی) سے اردو دنیا بہ خوبی واقف ہے لیکن ان کی کلیات کی مختلف اشاعتوں کے باوجود کلام کی عدم دستیابی اہل ذوق کو کھلتی رہی ہے۔ پروفیسر نور الحسن ہاشمی کی ترتیب و تدوین یہ کلیات پہلی بار 1989 میں اتر پردیش اردو اکادمی سے شائع ہوئی تھی لیکن اس نسخے کی بھی عدم دستیابی کے سبب اکادمی کے اشتراک سے قومی اردو کونسل نے بہ نظر ثانی پروفیسر نثار احمد فاروقی (مرحوم) و بعد ازاں بہ نظر ثالث پروفیسر لئیق صلاح، حال ہی میں شائع کی ہے۔ اس کلیات کے متن کی تصحیح میں ہند و پاک کی تمام دستیاب اہم مطبوعات و مخطوطات سے استفادہ کیا گیا ہے جس کی وضاحت پروفیسر ہاشمی نے اپنے ''دیباچے''، ''مقدمے'' اور پروفیسر لئیق صلاح نے ''حرفے چند'' میں کیا ہے۔ ولی کی شاعری کی زبان سے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا تجزیہ بھی کلیات میں شامل ہے اور ولی کے کلام کے بعد اس کی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 433، قیمت -/148 روپے

کلیات سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی دکن کا وہ آخری بڑا شاعر ہے جس کی شاعری دکن اور شمال کی زبان کے بیچ احساسِ دوئی کو ختم کرتی ہے۔ انھوں نے 24 سال تک کے شعری سفر میں جو کچھ کہا ان میں سے دستیاب شدہ 508 غزلیں، 11 مثنویاں، 9 رباعیاں، ایک قصیدہ، 5 مستزاد، ایک ترجیع بند اور ایک مناجات اس کلیات میں شامل ہیں۔ اردو شعر و ادب میں سراج کی قادر الکلامی مسلم ہے، ان کے کلام کا انتخاب اردو دنیا کی تقریباً تمام درس گاہوں کے نصابات میں شامل ہے۔ اسی غرض سے قومی اردو کونسل نے ''کلیات سراج'' کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

محمد مشاہد

گلوبلائزیشن اور اردو

اکیسویں صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ جدید ایجادات اور دریافتوں کے سبب نت نئے انکشافات ہو رہے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ سائنسی انکشافات، دریافتیں اور نئی تحقیقات ابھی آخری منزل تک نہیں پہنچی ہیں بلکہ جب تک اس دنیا کو دوام حاصل ہے اس وقت تک انقلابات رونما ہوتے رہیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر وہ شے جو آج انسان کی ضروریات میں شامل ہے کل وہ بے کار ثابت ہو جائے اور اس کی جگہ دوسری نئی ایجادات لے لیں۔

جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانی زندگی کے تصور کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے جب جینے کے طریقے بدلیں گے تو اس تبدیلی سے زبان بھی لازمی طور پر متاثر ہوگی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عالمگیریت اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ سے ہمیں خواہ کتنا ہی فائدہ ہوا ہو لیکن لسانی معاملے میں بڑا نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے، کیونکہ عالمی گاؤں کے پھیلے ہوئے بازار میں چند زبانوں کی اجارہ داری قائم ہوگئی ہے اور علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ کئی بڑی زبانوں کے وجود کو بھی خطر لاحق ہوگیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اکیسویں صدی میں دنیا کی 90فیصدی زبانیں اور بولیاں معدوم ہوسکتی ہیں۔ حال ہی میں اقوام متحدہ کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ 2500 سے زیادہ زبانیں اور بولیاں اپنا وجود کھونے والی ہیں۔ کچھ اسی طرح کا خدشہ معروف ادیب نرائن تنیش نے اپنے ایک مضمون "Speech is culture part of our identity" شائع شدہ ٹائمز آف انڈیا 3 Jan 2007 میں ظاہر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ” عالمگیریت کی وجہ سے 3450 زبانیں اپنا وجود کھونے والی ہیں“

ایک ماہر لسانیات اروند کا خیال ہے کہ ” آج دنیا میں 6500-6800 زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں زیادہ تر زبانیں اپنا وجود کھونے والی ہیں کیوں کہ ہر دو ہفتے میں ایک زبان ختم ہو رہی ہے اس طرح درجنوں ہندوستانی زبانیں مستقبل میں اپنا وجود کھو دیں گی۔“ معروف ماہر لسانیات اینڈ ریوڈلی نے اپنی کتاب "Language in danger" میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دنیا میں الگ الگ اسباب سے کچھ زبانوں کی بالادستی قائم ہو رہی ہے جس کی وجہ سے کچھ زبانیں سمٹ کر تاریکی میں جا رہی ہیں اور یہ سب گلوبلائزیشن کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ گلوبلائزیشن کا مطلب ہی ہے پوری دنیا کا ایک گاؤں میں تبدیل ہونا اور یہ تبدیلی صرف ساز و سامان کی تجارت تک محدود نہیں بلکہ اس کا اثر انسانی زندگی کے ہر شعبے پر ہو رہا ہے۔ جہاں تک زبانوں پر اس کے اثرات کا تعلق ہے دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو پر بھی اس کے اثرات نظر آ رہے ہیں۔ عالمگیریت کے پردے میں ایک بار پھر ساری دنیا کو ذہنی طور پر غلام بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ انگریزی دور حکومت میں تعلیم کے میڈیم کے سوال پر لارڈ میکالے نے انگریزی کے حق میں دلائل دے کر ہندوستانی زبانوں کی اہمیت کو گھٹانے کی ایک کوشش کی۔ اب انگریزی کو گلوبلائزیشن کی زبان قرار دینے کے پس پردہ پوری دنیا پر انگریزی کو تھوپنے کی کوشش ہی تو کی جا رہی ہے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ زبان صرف ذریعۂ اظہار ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کا پیمانہ بھی ہے۔ کسی زبان کو قبول کرنے کا مطلب ہے اس کی روایت، فکر اور تہذیب کو قبول کرنا۔ جیسا کہ فش مَن نے کہا ہے ” زبان محض تبادلۂ خیال کا ذریعہ نہیں، بلکہ مختلف خیالات، احساسات نظریات سے، خواہ وہ پوشیدہ ہوں یا واضح، خود ایک مکمل نظام کی حیثیت رکھتی ہے زبان کے ذریعے ہی مختلف حالات و موضوعات اور سماجی اقدار ظاہر ہوتی ہیں۔“

سائنس کا ایک اصول ” جہد اللبقا “(Survival of the fittest) ہے یعنی صرف وہی چیزیں باقی رہ سکتی ہیں جو حالات سے مطابقت پیدا کر لیں۔ اس کا مطلب ہے جو زبانیں زمانے کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتیں وہ معدوم ہو جائیں گی۔

بحالات موجودہ اردو آبادی بھی انگریزی کو ہی ترقی اور عزت افزائی کی کنجی تصور کرنے لگی ہے۔ چین، جاپان، فرانس اور جرمنی کے ساتھ کئی ممالک نے بھی اسے اپنی زبانوں کے لیے ایک خطرہ تصور کیا ہے۔ اس کے ردعمل کے طور پر فرانس نے اپنی فرنچ سے ان الفاظ کو نکال دیا ہے جو انگریزی سے لیے گئے تھے۔ ہمارے معاشرے میں جن لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ انگریزی کے بغیر ترقی ناممکن ہے، ان کو چین، جاپان اور جرمنی سے سبق سیکھنا چاہیے کہ ان ممالک نے اپنی اپنی زبان کی بدولت ہی تمام تر ترقیاتی منازل طے کیے ہیں۔

اب سوال اٹھتا ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو زبان کے سامنے کیا چیلنج ہے؟ اور اس عالمگیریت سے مقابلہ کرنے کی اس میں صلاحیت ہے یا نہیں۔ آج تعلیم برائے تعلیم ایک تخیل بن گیا ہے اور تعلیم برائے تہذیبی تشخص اور تعلیم برائے معاش کا تصور عام ہوگیا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی ہر پانچ دس سال کے بعد حاصل شدہ علم کو بے معنی بنا دیتی ہے۔ ایسے حالات میں اردو زبان کا کیا

مستقبل ہوگا اور اردو محدود ہوتی جائے گی یا اس کا دائرہ اور وسیع ہوگا۔

موجودہ دور میں وہی زبان اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہے جو وسیع سے وسیع تر ہوتے ہوئے بازار کی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور جس کا تعلق پیداوار اور مواصلات کے عمل سے ہو۔ جو معقولیت پسندی کی داعی ہو اور جسے صرف اس کے بولنے والوں کا ہی نہیں بلکہ مارکیٹ کا سہارا بھی ہو۔ چونکہ اردو ادب صرف برصغیر تک محدود نہیں ہے بلکہ عالمی سطح پر اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے اندر ایسی قوت پیدا کی جائے جس کی بدولت عالمی مارکیٹ میں اس کی پکڑ مستحکم ہو سکے۔

اردو زبان میں یہ صلاحیت ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر سکے کہ اس میں لچک ہے، حالات کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت ہے۔ اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ مختلف زبانوں کے الفاظ بڑی خوش اسلوبی سے اس میں سما جاتے ہیں اور ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ کسی بھی زبان کی بقا کا انحصار اس کے بولنے والوں کے حرکت و عمل پر ہے اور کسی بھی زبان کی بقا اس زبان کی تعلیم میں ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو زبان کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو کی تعلیم کو ایک تحریک کی صورت دی جائے اور ساتھ ساتھ اردو آبادی کو اس احساس کمتری کے خول سے باہر نکالا جائے کہ بغیر انگریزی کے ہماری دنیا سنور نہیں سکتی۔ یہ کمپیوٹر کا عہد ہے زندگی کے ہر شعبے میں اس کا دخل ہے اور یہ زندگی کا اہم حصہ بن گیا ہے، ایسے میں اردو زبان کو کمپیوٹر سے منسلک کرنا وقت کی پکار ہے۔ اگر آج ہم اردو کو کمپیوٹر سے جوڑ دیتے ہیں اور کمپیوٹر کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تو عالمی گاؤں میں اردو کی شناخت مزید مستحکم ہوگی اور اس کے اپنانے والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا۔

آج ہم مادیت اور صارفیت کے دور سے گزر رہے ہیں، ہر چیز کو نفع اور نقصان کی میزان پر پرکھتے ہیں اس لیے ہم اس اندیشے میں مبتلا ہیں کہ ہمارے بچے اردو تعلیم حاصل کر کے روزگار اور کاروبار کے میدان میں دوسرے شہریوں کے مقابلے میں پیچھے رہ جائیں گے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ دوسروں سے کم تر نہیں ہیں۔ اردو میں شعبہ جات کے علوم و فنون سے متعلق معلومات کا ذخیرہ موجود ہے، اصطلاحات کی کمی نہیں۔ قدیم دہلی کالج میں اردو کے ذریعے مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو کو اختیار کیا گیا اور اب مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں تمام شعبہ جات کا میڈیم اردو ہے یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ مختلف شعبوں مین کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔

اردو زبان میں وہ علمی و فکری سرمایہ موجود ہے جس کی بدولت ہم ان طاقتوں کو اپنی گرفت میں لا سکتے ہیں جن کے ذریعے ہم اپنی موجودہ پسماندگی کا ازالہ کر سکیں۔

□□□

Deptt. of Education,
Maulana Azad National Urdu University,
Gowchi Bowli, Hyderabad-32

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آرہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایسے میں محاسبے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، وِنگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

مہیش بھٹ/ترجمہ: اسلم پرویز

اردو اور میں

انسان یادوں کا پُتلا ہے اور یاد کا دوسرا نام آواز ہے۔ سب سے پہلی آواز جس کی جھنکار میں اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں وہ لفظ ''شیریں'' ہے جس کے معنی ہیں میٹھا۔ ''شیریں'' میری ماں کا نام ہے جو پیدائشی طور پر ایک شیعہ مسلم تھی اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک وہ یہی رہی۔

لیکن اس شیریں یاد کی چھاؤں میں زمہریر کی سی ٹھٹھرن ہے۔ میری ماں میرے ہندو باپ کے ساتھ شادی کے بندھن میں نہیں بندھ سکی اس لیے کہ تقسیم کے بعد کے ہندوستان میں میرے باپ اپنے کٹر برہمن خاندان کے خلاف نہیں جا سکتے تھے۔ میری ماں نے اپنی مسلم شناخت کو ممبئی کے ہندو اکثریت والے اس شیواجی پارک علاقے میں چھپائے رکھا جس میں ہم رہتے تھے اور ایسا اس لیے تھا کہ نہرو کی اس روشن دماغی کے باوجود کہ ہندوستان ایک کثیر الجہات اور رہمہ رنگ قوم سے عبارت ہے، ملک میں تیزی سے سر اٹھاتی ہوئی بنیاد پرست ہندو تحریک مسلم اقلیتی فرقے کو ایک ایسا دشمن گردانتی تھی جو اس کے گھر میں گھسا بیٹھا تھا۔ چنانچہ اس امکان پر انحصار کرتے ہوئے کہ سرپھرے ہندو، بنیاد پرست ہندوؤں کا ساتھ دیں گے ان بنیاد پرست ہندوؤں نے اپنی اصل شناخت کو بنیاد پرستی کے بھنور میں ڈبو کر رکھ دیا— ''مجھے میرے مسلم نام سے کبھی مت پکارنا۔'' ہماری ماں تنہائی میں ہمیں خبردار کرتی تھی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ دنیا کو میری مسلم شناخت کا پتا چلے۔''

مشتبہ وفاداریاں: یہ وہ زمانہ تھا جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ اردو ان لوگوں کی زبان ہے جنھوں نے ملک تقسیم کرایا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی وفاداری پر ہمیشہ شک کیا جاتا تھا۔ اکثریتی فرقے کی قوم پرستانہ تشویش کے تدارک کے لیے ہندوستانی مسلمان کو لگاتار اپنی ہندوستانیت اور وطن پرستی کا ثبوت دینا پڑتا تھا اس لیے کہ اکثریتی طبقے کے وہ گھاؤ ابھی نہیں بھرے تھے جو تقسیم کی ناخوشگواری نے اسے دیے تھے۔

تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ یہ شیعہ عورت جو ایک برہمن قلم ساز کے ساتھ ''گناہ گار'' کی سی زندگی گزار رہی تھی اس نے اپنے تمام بچوں کے ہندو نام رکھے، اس نے ہمیں ایک ایسے عیسائی اسکول میں بھیجا جسے اٹلی کے پادری چلاتے تھے جہاں ہم نے اچھی انگریزی اور بے تکی نرسری rhymes سیکھیں اور جہاں ہم نے ہندوؤں کی حیثیت سے پرورش پائی۔

اسی کے ساتھ شیعہ عورت نے، جس نے ہندو کا بہروپ بھر رکھا تھا مجھے شِو گنیش اور پاروتی، رام، سیتا اور ہنومان اور مہابھارت جیسے عظیم رزمیے کی طلسماتی دنیا کی سیر کرائی— ''تم ایک ناگر برہمن کے سپوت ہو، تمھارا تعلق بھار گو گوتر سے ہے۔''— وہ کہا کرتی۔ اور اسی کے ساتھ اگلے ہی سانس میں اپنی انتہائی شائستہ اردو میں کلمے کا مطلب بھی بتاتی اور مجھ سے کہتی ''یا علی مدد'' کا ورد کرو۔ اور اگر ایسے میں کسی مخالف عقیدے والے سے مڈبھیڑ ہو جائے تو قولِ محال "Paradox" کی سی صورت تھی۔

یادداشتوں کا ایک بلبلہ پھوٹ پڑتا ہے۔ یہ 1958 کی بات ہے۔ میں اس وقت مشکل سے نو برس کا تھا۔ ہمارے گھر کا ماحول افسردہ تھا۔ ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کے گلابوں کی کیاری کا ایک پھول مرجھا گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد چل بسے تھے، آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگرام سے میری ماں بیٹھی مولانا آزاد کے جنازے کے جلوس کا حال سن رہی ہے۔ اچانک ہی میرے باپ جو اس عظیم قوم پرست کی موت سے پریشاں خاطر تھے، تیزی کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ ریڈیو پر اردو براڈ کاسٹ کو سنتے ہوئے انھوں نے خشم گیں انداز میں کہا ''اس پاکستانی ریڈیو کو بند کرو۔ میں یہ خبر اردو میں نہیں ہندی میں سننا چاہتا ہوں۔'' میری ماں چپ چاپ ریڈیو بند کر دیتی ہے لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اسے کتنا گہرا صدمہ پہنچا تھا۔

سیاست شخصیت کی پرچھائیں: سیاست کو شخصیت کی پرچھائیں کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ان بہت سی مشکلات کا اشاریہ ہے جو اس وقت اردو کی راہ میں حائل تھیں۔ آزادی کا پہلا عشرہ ابھی ختم ہونے کو تھا۔ میرے باپ جو ایک سیکولر برہمن تھے انھوں نے اپنے اس اقدام سے مجھے ایک سبق سیکھنے کا موقع دیا۔ برداشت یعنی tolerence کا دوسرا مطلب ہے برتری، جہاں اکثریتی فرقہ بڑے مشفقانہ انداز میں اقلیتی فرقے کے سر پر اپنی برتری کا دستِ شفقت رکھ دیتا ہے لیکن معاملہ جوں کا توں ہی رہتا ہے۔ یہی اکثریتی فرقے کی نام نہاد برداشت کی حد ہوتی ہے۔

میری ماں کی زبان مر رہی تھی اور میں اسے زندہ رکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے جیسے سال بیتتے گئے میں نے محسوس کیا کہ اردو کو بولتا ہوا دیکھے جانے کی جگہ صرف میرے باپ کی فلموں کے سیٹ تک محدود ہو کر رہ گئی

تھی۔ میرے باپ ''بغداد کا چور'' اور ''سند باد جہازی'' جیسی سحر انگیز مسلم فنتاسی فلمیں بناتے تھے۔ یا پھر خفیہ طور پر میری ماں کے ساتھ محرم کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، جہاں لہو میں ڈوبے ہوئے کربلا کے واقعات رقّت کے ساتھ بیان کیے جاتے تھے۔ یا پھر سینما ہال کی تاریک آسودگی میں ''مغلِ اعظم'' اور ''چودھویں کا چاند'' جیسی فلمیں دیکھتے تھے یا پھر میری اداکارہ خالہ پورنما کے گھر پر جو میری ماں کے بالکل الٹ ایک کامیاب اداکارہ تھیں۔ پورنما خالہ کو اپنی مسلم شناخت پوشیدہ رکھنے کی کبھی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی اور مجھے وہ بہت اچھی لگتی تھیں اپنی جرأت مندی کی وجہ سے اور اپنی انتہائی شائستہ اردو گفتگو کے سبب بھی۔

لڑکپن کی عمر تک پہنچتے پہنچتے مجھے محسوس ہونے لگا کہ اردو میری نہیں کسی اور کی زبان تھی اور مجھ پر یہ بھی کھلا کہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود میری مسلم ماں اپنے ہی وطن میں ایک اجنبی بن کر رہی۔ جب بھی میں اس کی اصل شناخت پر سے پردہ اٹھانے کی باغیانہ کوشش کرتا تو وہ میری اس کوشش کا گلا یہ کہہ کر گھونٹ دیتی تھی کہ یہ ان کا ملک ہے اور ہمیں ان کے اشاروں پر چلنا ہے لیکن میں اس کی عینک سے یہ سب کبھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

جذبات کی رواردو: میں محسوس کرتا تھا کہ اردو اور اسلام میری میراث کا حصہ ہیں۔ جیسے جیسے سال گزرتے گئے میرے اندر یہ شعلہ بھڑکتا رہا کہ اپنے آپ سے یہ سوال کروں کہ آخر میں ہوں کون۔ میں اپنے ایک حصے سے انحراف کرکے مکمل طور پر اپنا آپ نہیں ہوسکتا۔ محرم کے دوران میرا شعور حسن حسین کے نام کا ورد کرتا ہے، گنیش اتسو پر میرے ہردے میں منگل مورتی موریا کی گھنٹیاں بجتی ہیں اور میرا کرسچین اسکول مریم کو تحیہ وسلام بھیجتا ہے۔ مجھ جیسے قول محال کے اظہار کا ذریعہ اگر کوئی زبان ہوسکتی ہے تو وہ صرف اردو ہے اور اگرچہ میرے ذخیرۂ الفاظ میں اردو لفظیات کا اسلحہ خانہ نہیں پھر بھی اردو کا emotional syntax میرے اندر کارِ سرگرم ہے۔

آئین میں ہونے والی ترانوے ویں ترمیم کے بعد اردو بولنے والوں کے اس بنیادی حق کو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں۔ اس اعتبار سے تعلیم کی پرائمری اور سیکنڈری سطح پر اردو کی تعلیم اور تدریس کی ترویج ریاست کی ذمے داری ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تمام محبانِ اردو کو حکومت کو اس بات پر مجبور کرنا چاہیے کہ وہ اس معاملے کو اشد ضروری سمجھتے ہوئے اردو بولنے والوں کے اس بنیادی حق کو جلد سے جلد حقیقت میں بدلیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ حقیقت کب ہمارے اہلِ وطن پر منکشف ہوگی کہ اردو ہندوستان کی ایک زبان ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو لوگ اردو کے مخالف ہیں ان پر یہ حقیقت کب اور کیسے کھلے گی کہ اردو کے لیے لڑی جانے والی لڑائی دراصل ہندوستان کے لیے لڑی جانے والی لڑائی ہے۔

(بشکریہ سہ ماہی اردو ادب، دہلی، جنوری۔ مارچ 2009)

□□□

تاریخِ تعلیم ہند

مصنف: سیّد نور اللہ/ جے. پی. نائک، مترجم: مسعود الحق

اس کتاب میں 1765 سے 1947 تک ہندوستان میں عہد بہ عہد ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں کا مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی تاریخ کی ہر اہم منزل پر ایک مکمل اور جامع تبصرہ کرنے، ہر اہم فیصلے کے پیچھے کارفرما اسباب اور ان کے اثرات کو سمجھانے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کس طرح وجود میں آیا ساتھ ہی یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ تعلیمی اقدام صرف حال ہی کے سمجھنے میں معاون نہ ہو بلکہ مستقبل کی اصلاحات اور تنظیمِ نو کے رخ کی بھی نشان دہی کرے۔

صفحات: 190، قیمت -/250 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

دردانہ قاسمی

قرۃ العین حیدر کے ادبی اور شخصی رویے

ایک ذاتی تاثر

میں نے بی. اے. کے زمانے میں ہی قرۃ العین حیدر کی تحریروں کو نصابی کتابوں میں پڑھ کر ان کے افسانوں میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ اسی زمانے میں ان کا ناول ''آگ کا دریا'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ناول کی شہرت نے مجھے اسے پڑھنے کی طرف مائل تو ضرور کر دیا لیکن ایسا لگا کہ اس ناول کا کوئی اور ہے نہ چھور۔ میں ناول کی ابتدا میں ایک انگریزی نظم کے حوالے کی نہ معنویت سمجھ سکتی تھی اور نہ قدیم تاریخ کے افراد اور ان کی تلمیحی انداز کی کردار نگاری، میری گرفت میں آئی۔ ایسا لگا کہ کرداروں کی زبان سے فلسفیانہ خیالات کا بیان کیا گیا ہے، جن کی وجہ سے واقعات کی ترتیب قائم کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ اس وقت شعور کی رو، وغیرہ کے نام سے بھی میں ناواقف تھی، ورنہ آسانی سے ہار مان لیتی۔ اپنے ایک استاد سے اپنی اس الجھن کا ذکر کیا تو انھوں نے اس کا تاریخی سیاق وسباق بتایا اور یہ اشارہ بھی کیا کہ اس ناول میں ہندوستان کی تقسیم اور مذہبی منافرت کے مسئلے کو تاریخی حوالے کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان معمولی اشاروں سے مجھے ایسا لگا کہ مجھ پر ''آگ کا دریا'' کی تفہیم آسان ہوگئی ہے اور میں نے کسی حد تک اس ناول کو سمجھ کر پڑھ لیا۔ اس کے بعد ''آخر شب کے ہم سفر''، ''سیتا ہرن''، ''پت جھڑ کی آواز''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' اور ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو'' جیسے ناول اور افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

یہ پس منظر بیان کرنے کا سبب دراصل اس تجربے کا اظہار کرنا ہے، جب ان سے براہِ راست رابطہ قائم ہوا اور میں نے انھیں اپنی تحقیق کے معاون اور مشیر کے طور پر دیکھا۔ یہ بات ان دنوں کی ہے جب میں نے تازہ تازہ ادب لطیف کے موضوع پر ایم.فل کیا تھا اور پی.ایچ.ڈی. کے لیے اپنے تحقیقی کام کی ابتدا ہی کی تھی جس کا موضوع تھا'' سجاد حیدر یلدرم اور ادب لطیف'' اور میری نگراں تھیں پروفیسر ثریا حسین صاحبہ۔ ابتدا میں مواد جمع کرنے، اس کو تحریری طور پر مرتب کرنے اور تحقیق کے تقاضوں کے نبھانے کے مسائل درپیش تھے۔ میں بار بار ثریا حسین صاحبہ سے اپنی مشکلات کا ذکر کرتی۔ ایک دن اچانک ثریا آپا نے کہا کہ کیوں نہ تم عینی بی (قرۃ العین حیدر) سے اس سلسلے میں مدد لو اور ان کو تفصیلی خط لکھو۔ میں نے ثریا آپا کو کچھ جواب نہ دیا، لیکن دل میں سوچا، کہاں قرۃ العین حیدر اور کہاں میں؟ وہ میرے خط کا جواب بھلا کیوں دیں گی اور وہ کیوں مجھے قابل اعتنا سمجھنے لگیں؟ لیکن ثریا آپا کے اصرار پر میں نے کہا کہ آپ ایک سفارشی خط لکھ دیجیے۔ ثریا آپا نے کہا اچھا میں تمھارے خط کے ساتھ ان کے نام چند تعارفی جملے لکھ دوں گی۔ خیر میں نے قرۃ العین حیدر صاحبہ کو اس امید سے خط لکھا کہ شاید وہ کچھ توجہ فرمائیں۔ ثریا آپا کا تعارفی خط میرے لیے فال نیک ثابت ہوا۔ انھوں نے میرے خط کو پڑھا اور خلاف توقع فوراً ہی اس کا جواب آگیا۔ ان کے خط کو دیکھ کر میں باغ باغ ہوگئی۔ انھوں نے اس بات پر بہت ہی خوشی کا اظہار کیا تھا کہ میں ان کے والد بزرگوار پر کام کر رہی ہوں۔ انھوں نے بڑی محبت اور اپنائیت سے میری ایک ایک بات کا ترتیب وار جواب لکھا تھا۔ ان کا خط پا کر ایسا لگا کہ ڈوبتے کو سہارا مل گیا ہے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اب میرا کام تیزی سے آگے بڑھ سکے گا۔ اس کے بعد ان سے میرا رابطہ مسلسل قائم رہا۔ مجھے جب بھی کوئی بات معلوم کرنی ہوتی، یا کسی پریشانی میں ہوتی، تو ان کو خط لکھ کر ان سے معلومات حاصل کرتی۔ وہ اپنی تمام مصروفیتوں کے باوجود مجھے پہلی فرصت میں جواب لکھتیں۔ بلکہ انھوں نے مجھے ممبئی آنے کی دعوت بھی دی اور لکھا کہ آپ جب بھی موقع نکال سکیں ممبئی ضرور آئیں اور آنے سے پہلے خبر کردیں۔ اس طرح خط وکتابت کا سلسلہ کافی عرصے تک قائم رہا۔ یلدرم کی کتابوں کے سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ فلاں فلاں کتابیں میرے پاس بھی نہیں ہیں، میں ان کی تلاش میں ہوں، اگر آپ کو پتہ چل جائے تو مجھے ضرور خبر کیجیے گا۔ میں نے ان کے سارے تو نہیں، لیکن کچھ خطوط محفوظ کر رکھے ہیں، جو الگ سے شائع کرانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔

قرۃ العین حیدر بہت نازک مزاج اور زود رنج واقع ہوئی تھیں۔ میں تو خیر ان کی ایک نیاز مند تھی اس لیے ناراضگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، لیکن ڈرتی تھی کہ پتہ نہیں کون سی بات انھیں بری لگ جائے اور وہ خفا ہو جائیں۔ ان کا مزاج جلد ہی گھل مل جانے والا نہیں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے ہی کسی سے بے تکلف ہوتی تھیں۔ اس کا ذاتی تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب شادی کے بعد جون 1979 میں میں اور میرے شوہر چھٹیاں گزارنے سری نگر گئے تھے۔ سری نگر میں ہمارا قیام، اس وقت کے سری نگر کے ٹیلی ویژن ڈائرکٹر مظہر امام صاحب کے گھر پہ تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ان دنوں قرۃ العین صاحبہ بھی کشمیر چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی ہیں اور پڑوس میں ہی اپنی کزن کے ہاں ٹھہری ہیں۔

ہم لوگوں کے پروگرام کی تفصیل مظہر امام صاحب کو معلوم رہتی تھی۔ انھوں نے ہماری ملاقات کرانے کے لیے اسی مناسبت سے ان کی دعوت اپنے گھر طے کرلی۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ ان کو گفتگو میں اتنا محتاط پایا کہ اندازہ ہوا کہ ان کی قربت آسان نہیں، میں اتنی بڑی ادیبہ سے اتنی آسانی سے ملاقات کا شرف حاصل کرپاؤں گی، مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ پہلے تو میں ڈری ڈری سی رہی، لیکن تھوڑا وقت گزرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ بہت ہی مخلص اور مزے مزے کی باتیں کرنے والی خاتون تھیں۔ اب سارا تکلف جاتا رہا، ساری احتیاط غائب، ہر طرح کی گفتگو، افواہوں پر رائے زنی، ادیبوں کے لطیفے حتیٰ کہ غیبتیں بھی۔ پھر تو کشمیر میں ہم لوگوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا، ان سے مل کر خوشی کے ساتھ اس اتفاق پر فخر بھی ہوتا تھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے بہت خوش ہوتی تھیں۔ وہ اکثر اعلیٰ درجے کی ادیبہ اور مصنفہ کے بجائے ایک عام سلیقہ مند، نازک مزاج اور غیر معمولی حساس خاتون نظر آتی تھیں۔

اتفاق سے اس کے چند مہینے بعد ہی خود انھوں نے اطلاع دی کہ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے دہلی پہنچنے والی ہیں! میں ان سے دلی آکر ملوں۔ چنانچہ میں پہلی فرصت میں دہلی جا پہنچی اور تین چار روز وہاں قیام کر کے اپنے تحقیقی مقالے کو آخری شکل دینے کے معاملے میں ان سے رہنمائی حاصل کرتی رہی۔ ان کی ہدایات اور بہم پہنچائی ہوئی معلومات نے مقالے کی بہت سی غیر مربوط کڑیوں کو مربوط کرنے میں میری بڑی مدد کی۔ اب ایک دشواری یہ تھی کہ کسی تحقیقی مقالے میں غیر دستاویزی اور زبانی معلومات کے لیے حوالے کی گنجائش کہاں سے نکالی جائے۔ یہ مرحلہ میری نگراں پروفیسر ثریا حسین کے سبب آسان ہوا اور خدا خدا کر کے مقالہ جمع ہوگیا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میرے مقالے سے عینی آپا خوش اور مطمئن تھیں۔ مقالہ جمع ہونے کے بعد میں اپنی گھریلو مصروفیات میں گم تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج میں جزوی ملازمت کا آفر مل گیا۔ میرے لیے اس سے بہتر اور کیا بات ہوسکتی تھی۔ میں گھریلو ذمے داریوں کے ساتھ جزوی ملازمت میں خاصی مصروف ہوگئی۔

خط و کتابت کا سلسلہ تو اب پہلے کی طرح برقرار نہیں تھا مگر ثریا حسین صاحبہ سے ہر ملاقات میں ان کا ذکر ہوتا اور یہ بھی معلوم ہوتا رہتا کہ وہ کہاں ہیں اور ان کی کیا مصروفیات ہیں۔ اسی درمیان وہ ایک بار تقریباً دو ہفتے کے لیے یلدرم سیمینار میں شرکت کی غرض سے علی گڑھ بھی آئیں اور مجھے ان سے ملنے کے مواقع ملتے رہے، اس کے علاوہ ثریا آپا کے دور صدارت میں جب وہ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوئیں تو ان سے طویل ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ وزیٹنگ پروفیسر تو ایک سال رہیں، مگر اپنے دوسرے علمی کاموں کے سبب انھوں نے تقریباً دو سال یہاں قیام کیا۔ یونیورسٹی نے ان کے لیے گیسٹ ہاؤس میں قیام کا نظم کیا تھا مگر انھوں نے اپنی کزن ثریا حسین صاحبہ کے ہاں رہنا زیادہ پسند کیا اور پورے عرصے ان کا قیام وہیں رہا۔ وہ اس زمانے میں شعبۂ اردو میں طلبہ کو درس بھی دیتی تھیں اور ریسرچ اسکالرز کی مشکلات میں تعاون بھی فرماتی تھیں۔ خالی اوقات میں وہ اپنا ناول ''گردشِ رنگ چمن'' لکھنے میں مصروف رہتیں۔ ناول لکھنے اور اس سے متعلق ریسرچ میں ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ اٹھتے بیٹھتے یہی موضوع زیر بحث رہتا۔ ثریا حسین صاحبہ کے شوہر پروفیسر اظہار حسین تھے تو شماریات کے پروفیسر، مگر شعر و ادب کا نہایت اعلیٰ درجے کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ اکثر ان سے بحث و مباحثے ہوتے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ وہ اپنے مسودے کو آخری شکل دینے میں بہت زیادہ وقت لگاتیں۔ کئی سو صفحات پر پھیلے مسودے کو انھوں نے پانچ بار سے کم نہیں لکھا ہوگا۔ تقریباً دو سال تک لگاتار وہ اسی ناول کو لکھنے اور نظرثانی کرنے میں مصروف رہیں۔ اگر کوئی محقق ان کے نظرثانی شدہ مسودوں کا موازنہ کر کے ان کے لکھنے کے طریق کار پر تحقیق کرنا چاہے تو یہ ایک بہت اہم موضوع ثابت ہوسکتا ہے۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ جب اتنی بڑی مشاق ادیبہ اپنی تحریروں کو بار بار کاٹتی اور اضافے یا تبدیلی کرتی تھیں تو عام مصنفین کو کتنی احتیاط برتنی چاہیے۔ شاید ان کی عظمت کی ایک بڑی وجہ اپنی تحریروں سے ان کی بے اطمینانی بھی تھی۔

علی گڑھ میں ان کے قیام کے دوران ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ادب کے طالب علموں سے مل کر وہ اپنے آپ کو مطمئن اور خوش و خرم محسوس کرتی تھیں۔ ان کی کلاس میں تدریس کا انداز کم ہوتا تھا۔ وہ اکثر کلاس میں ادبی محفل، علمی گفتگو اور بحث و مباحثہ کا ماحول قائم کردیا کرتی تھیں۔ وہ اکثر نوجوان لڑکے لڑکیوں کے مطالعہ نہ کرنے، بالخصوص فکشن کی روایت سے بے خبر ہونے کا شکوہ کیا کرتیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ انھوں نے اپنے زمانۂ قیام میں علی گڑھ میں فکشن کے مطالعے اور مقبول فکشن لکھنے والوں کے قارئین کی تعداد کے سلسلے میں ایک بڑا اہم سروے بھی کرایا تھا۔ اس سروے کا دائرہ صرف اردو کے طلبہ اور اساتذہ کے بجائے مختلف شعبہ جات کے طلبہ اور اساتذہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ اس سروے کے نتائج کو مضمون کی شکل میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کرائیں گی۔ اگر یہ سروے شائع ہوتا تو شاید بہت کارآمد ہوسکتا تھا۔ انھوں نے شعبۂ اردو سے وابستگی کے زمانے میں ایک اور اہم کام مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی تاریخ مرتب کرنے کا بھی بذات خود انجام دیا۔ چوں کہ ان کو اپنے والد بزرگوار سجاد حیدر یلدرم کے سبب اس شعبے سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ انھوں نے ایسے شواہد اکٹھے کیے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ 1920 کے بعد کئی سال تک یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار کی حیثیت سے یلدرم نے نئے قائم شدہ شعبۂ اردو کے صدر شعبہ ہونے کے بھی فرائض انجام دیے تھے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ عینی آپا اپنی نازک مزاجی کے لیے مشہور بھی رہی ہیں اور بعض لوگوں کی نظر میں معتوب بھی۔ مگر سچ یہ ہے کہ وہ جس خاندان کی چشم و چراغ تھیں اور خاندانی پرورش و پرداخت کے نتیجے میں جس قسم کے آداب اور تہذیبی اقدار ان کے مزاج کا حصہ بن گئے تھے ان کے زیرِ اثر سطحیت اور آداب و لحاظ سے لوگوں کی بے اعتنائی ان کو مشتعل کر دیتی تھی، بہت سے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ ایک ساتھ مشرقی تہذیب کی دل دادہ بھی تھیں اور مغربی تعلیم اور تہذیب کی نمائندہ بھی۔ مگر شاید ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں۔ جہاں تک رہن سہن، حفظِ مراتب، معاصرین اور ہم سفر ادیبوں کے پاس اور لحاظ کا سوال ہے تو وہ ان معاملات میں پوری طرح مشرقی طور طریقے اپناتی تھیں۔ اور روشن خیالی، علوم و فنون اور بالخصوص خواتین کے علمی اور تہذیبی معاملات میں مردوں کی برابری کا جہاں تک سوال ہے تو وہ ان معاملوں میں پوری طرح مغربی طرز فکر کی نمائندگی کرتی تھیں۔ وہ محض ایک افسانہ نگار اور ناول نگار نہیں تھیں بلکہ ممتاز عالمہ اور دانش ور بھی تھیں۔ انھوں نے خود کو کبھی گھریلو قسم کی خاتون نہیں بننے دیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی گھریلو ذمے داریوں کے معاملے میں بھی گھریلو ملازم یا ملازمہ کی دست نگر رہا کرتی تھیں، ایسا لگتا تھا کہ دنیا کی عملی سوجھ بوجھ بھی ان کے اندر برائے نام ہی تھی۔ ان میں کچھ ایسی خود اعتمادی تھی کہ ان کو قریب سے جانے بغیر اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ دنیاوی معاملات میں کس قدر سادہ لوح تھیں۔ کبھی کبھی اچانک ان پر انکشاف ہوتا کہ فلاں شخص جس کو وہ عرصے سے قابلِ اعتبار سمجھ رہی تھیں وہ بڑا ہی بے اعتبار ہے اور بھروسے کے قابل نہیں۔ اس کے بالکل برخلاف بعض لوگوں کی سوجھ بوجھ اور دور اندیشی بھی کبھی کبھی اچانک ان پر منکشف ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اور میرے علاوہ جو طالبات ان کے علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں ریسرچ کر رہی تھیں، ان کے بارے میں عینی آپا کی رائے تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ وہ ہندی برائے نام جانتی تھیں اس لیے ہندی میں کوئی دفتری خط آجاتا تو ہم لوگوں سے پڑھواتی تھیں، اگر کسی طرح پڑھ بھی لیتیں تو بہت سے الفاظ ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ مگر ہم میں سے اگر کسی کو اچھی انگریزی یا عربی یا فارسی آتی تو وہ بے حد خوشی کا اظہار کرتی تھیں۔ فارسی تو خیر وہ خود بھی اچھی طرح سمجھ لیتی تھیں مگر عربی کے مصادر اور لفظی تبدیلیوں کو سمجھنے کی ہمیشہ خواہش مند رہتی تھیں اور جو سمجھ سکتا تھا اس پر رشک کرتی تھیں۔

عینی آپا اپنے مزاج کی افراط و تفریط کے باوجود بعض معاملات میں بہت سخت گیر اور چوکنا رہتی تھیں۔ اپنے خاندان کے شکوہ، اپنے والدین کی عظمت، اپنی عمر اور اپنی تاریخ پیدائش کے معاملے پر وہ کسی طرح کی مفاہمت گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اپنی عمر کے بارے میں ہر وقت انھیں اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کوئی ان کا سال پیدائش 1928 سے پہلے کا نہ لکھ دے۔ اس کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ اس وقت ہوا جب پروفیسر ثریا حسین نے شعبے کی طرف سے سجاد حیدر یلدرم پر ایک سیمینار کا انعقاد کرایا۔ چوں کہ اس سیمینار کی منتظم میری نگراں تھیں اور یلدرم میرا موضوع تھے، اس لیے سیمینار کے موقع پر جو تعارفی کتابچہ چھپا وہ مجھ سے لکھوایا گیا تھا۔ اتفاق سے اس زمانے میں وہ اپنے کسی اہم ناول کو آخری شکل دینے میں بہت زیادہ معروف تھیں۔ تاہم انھوں نے ثریا آپا کی دعوت قبول کی اور تقریباً ہفتہ بھر پہلے علی گڑھ تشریف لے آئیں۔ کتابچے کا مسودہ جب ان کو دکھایا گیا تو اس میں یلدرم کی صاحب زادی قرۃ العین حیدر کا سال پیدائش 1926 لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ چراغ پا ہو گئیں۔ وہ چونکہ مجھ سے خوب واقف تھیں اس لیے شاید ان کو یہ توقع نہ تھی کہ ان سے تصدیق کرائے بغیر میں صرف دوسری تحریروں پر انحصار کروں گی۔

چنانچہ مجھے بلوا کر انھوں نے مجھ سے اس طرح بات کرنی شروع کی جیسے پہلے سے ان سے کوئی راہ و رسم ہی نہ رہی ہو۔ انھوں نے 1926 کے سال کو بہ اصرار غلط قرار دیا۔ میں نے ثبوت کے طور پر فوراً رسالہ ''نگینڈنڈی'' کا یلدرم نمبر پیش کر دیا جو میرے لیے ہی نہیں بلکہ یلدرم پر کام کرنے والے کسی بھی شخص کے لیے اس وقت بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے بعض اور بھی حوالے دیے، مگر وہ نہیں مانیں۔ میرا کیا تھا۔ یلدرم کی بیٹی کی تاریخ پیدائش میرے لیے ایسا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، جس پر اس قدر برہمی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت تک یلدرم پر اگر کوئی تاریخی دستاویز موجود تھی تو وہ رسالہ ''نگینڈنڈی'' کا یلدرم نمبر ہی تھا، یا پھر پاکستان میں سید معین الرحمٰن نے یلدرم کے نمائندہ افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کرایا تھا۔ ویسے ادبِ لطیف پر ڈاکٹر عبدالودود کی کتاب اس سے کچھ عرصے پہلے منظر عام پر آئی تھی مگر اس کتاب میں چوں کہ تمام رومانی نثر نگاروں کی تحریروں کو زیرِ بحث لایا گیا تھا، اس لیے خصوصیت کے ساتھ سجاد حیدر یلدرم پر توجہ صرف نہیں کی گئی تھی ان کی تحریروں کا ذکر تو تھا مگر کسی افسانے یا انشائیے کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ بعد میں جب 1980 میں یلدرم صدی تقریبات منائی گئیں تو اس موقع پر اور اس کے بعد بعض اور بھی کتابچے اس موضوع پر منظر عام پر آئے، مگر بعد کے زمانے میں چھپنے والے رسائل میں قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' کے حوالے شامل ہونے لگے تھے۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ قرۃ العین حیدر یلدرم کی صاحب زادی تھیں اور ان کی تحریریں کم از کم اپنے خاندان کے بارے میں جانب داری سے بلند نہیں ہو سکتی تھیں۔ ان تحریروں میں اپنے خاندان بزرگوں کی انگریزی دانی، خواتین کی روشن خیالی اور ان کا وائلن اور ستار بجانے کا مشغلہ، موسیقی سے دلچسپی اور آزادیٔ نسواں کے بارے میں ان کی والدہ اور دوسری خواتین کے مبالغہ آمیز خیالات کو بعض لوگ عینی آپا کے رومان پسند ذہن کے شاخسانے کا نام دینے سے بھی باز نہ آئے، اور یوں

بھی کوئی حقیقت پسند محقق اس طرح کی مثالی باتوں کو مغربی تہذیب کے فیشن کی دل دادگی اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ روشن خیال اور اعلیٰ طبقے کی نمائندگی کرنے پر اصرار کے علاوہ کوئی اور نام دے بھی نہیں سکتا۔

عینی آپا اپنے والد بزرگوار کے ادبی رجحان کی ایسی دل دادہ تھیں کہ وہ ادب لطیف کے نمائندوں یا رومانی نثر نگاروں کی تحریروں کو عموماً تحسین کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ یہی نہیں وہ اپنے طرز تحریر پر رومانی نثر کا لیبل لگائے جانے پر بھی نہ صرف یہ کہ ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرتی تھیں بلکہ اسے اپنے لیے قابلِ امتیازات تصور کرتی تھیں۔ قرۃ العین حیدر کے بعض افسانوں اور ناولوں کے مطالعے سے مجھ پر اوّل اوّل یہی تاثر قائم ہوا تھا کہ وہ بنیادی طور پر رومانی لب و لہجے اور تاثراتی اسلوب کی ادیبہ ہیں۔ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میری ابتدائی تحریروں پر لوگوں کو انشائیہ سے قریب ہونے کا گمان ہوا تھا۔ اس موقع پر یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ یلدرم کا رومانی انداز تحریر ہو یا انشائیہ نگاری کا رجحان، کسی نہ کسی روپ میں اس کا اثر قرۃ العین حیدر کے انداز فکر پر بھی پڑا اور ان کے اسلوب تحریر پر بھی۔

عینی آپا ایک تخلیق کار تھیں اس لیے ان سے کسی محقق یا تنقید نگار جیسی مثالی غیر جانب داری کی توقع کرنا شاید حق بجانب بھی نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کار چوں کہ اپنے مزاج اور تخلیقی دانش کی رہنمائی میں ہنرمندی کے جوہر دکھاتا رہتا ہے۔ اس لیے غیر جانب داری اور معروضیت کی پابندی اس پر عائد بھی نہیں کی جاسکتی اور نہ کبھی اس کی فن کارانہ آزادی، کسی خارجی دباؤ کے زیر اثر پروان چڑھ سکتی ہے۔

□□□

پتہ:

Womens College, Aligarh Muslim University,
Aligarh-202002

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملاّ رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے 25 قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس انتخاب سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں ہے۔

صفحات: 655، قیمت -/457 روپے

ہند ایرانی ادبیات

مصنف: کبیر احمد جائسی

پروفیسر کبیر احمد جائسی نے اپنی اس کتاب ''ہند ایرانی ادبیات'' میں ہندوستان اور ایران کے مشترکہ ادبی سرمائے کے چند پہلوؤں پر اپنے مطالعے کا حاصل پیش کیا ہے۔ یہ مطالعے گیارہ موضوعات — بیدل شخصیت اور ماحول، خیام: از سید سلیمان ندوی پر ایک نظر، ہند اسلامی تہذیب کے ایرانی اور زردشتی عناصر، دیوانِ حافظِ ہندی، تفسیر القرآن کا فارسی ترجمہ، انشائے مومن پر ایک نظر، ہزارۂ اوّل ہجری میں ایران کی فارسی تفسیر نویسی، جہانگیر اور شاہ عباس کے غیر مطبوعہ خطوط، گلستاں کا باب پنجم، ایران میں آذری زبان کا مسئلہ اور ایران میری نظر میں، پر مشتمل ہیں۔

صفحات: 190، قیمت -/250 روپے

حیات افکار

علامہ اقبال اور سبرامنیم بھارتی

تمل زبان کی جدید شاعری میں سبرامنیم بھارتی کا کم وبیش وہی مقام ومرتبہ ہے جو اردو میں علامہ اقبال کا ہے جس طرح اقبال نے اپنے مخصوص فکر واسلوب کی بنا پر اردو شاعری کو ایک نیا رنگ اور آہنگ عطا کیا اسی طرح سبرامنیم بھارتی کی شاعری بھی تمل زبان وادب میں فکر وفن کی خوشگوار تبدیلی کا اہم نقطۂ آغاز ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اردو اور تمل زبان وادب میں جو انقلابی موڑ آیا اس کا سہرا ان دونوں شاعروں کے سر ہے۔

علامہ اقبال کے پہلے اردو مجموعۂ کلام ''بانگ درا'' کے دیباچہ میں شیخ عبدالقادر نے بڑی عمدہ بات کہی تھی کہ:

''غالب کو ان کی روح نے عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن میں آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا''۔(1)

سبرامنیم بھارتی کے سوانح نگار پریمانند کمار نے بھی کچھ اسی قسم کی بات کہی ہے کہ:

''تمل زبان کی روح مدت سے دعا میں مصروف تھی، اس کی یہ دعا بارگاہ ایزدی میں مقبول ہوئی اور بھارتی کی ولادت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔''(2)

اردو اور تمل زبانیں دو مختلف لسانی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں لیکن دونوں ہندوستانی زبانیں ہیں اور ان کی جڑیں ہندوستانی تہذیب میں پیوست ہیں۔ ان دونوں زبانوں کی ادبیات کے درمیان جو ایک مشترک زیریں لہر کام کر رہی ہے، اسے قومی لہر یا دھارے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مختلف علاقائی دھارے کس طرح ایک مشترکہ قومی دھارے کا روپ دھارن کرتے ہیں، اس کی نشاندہی ان دونوں شعرا کے تقابلی مطالعے کے ذریعے بخوبی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس نقطۂ نظر سے ان دونوں زبانوں کے بلند قامت شعرا کا تقابلی مطالعہ اردو کے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔

دونوں شاعر ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ سبرامنیم بھارتی کی پیدائش 1882 میں ہوئی اور اقبال کا جنم 1877 میں ہوا۔ اس طرح اقبال، بھارتی سے پانچ سال بڑے تھے۔ بھارتی کے مقابلے میں اقبال نے زیادہ عمر پائی کیونکہ بھارتی کا انتقال ایک حادثے میں 39 سال کی عمر ہی میں 1921 کو ہو گیا تھا جب کہ اقبال نے 61 سال کی عمر پائی ان کا سال وفات 1938 ہے، بھارتی کی سوانح نگار پریمانند کمار لکھتی ہیں:

''بھارتی کی ادبی زندگی دوسروں کے مقابلے میں بہت مختصر رہی مشکل سے چوبیس سال لیکن اس مختصر عرصے میں تمل زبان وادب نے جو چھلانگ لگائی ہے اس کا احاطہ مشکل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔''

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھارتی عدم آباد کا سفر اختیار کر چکے تھے جب اقبال نے یورپ کا سفر اختیار کیا تھا اس کی وجہ سے ان کے افکار میں بہت بڑی تبدیلی آئی۔ اس سے قبل وہ ایک محب وطن اور فطرت پسند شاعر کی حیثیت سے مقبول تھے۔ اقبال کے فارسی شعری مجموعے اگرچہ اس سے پہلے منظر عام پر آ چکے تھے لیکن ''بانگ درا'' کی اشاعت 1924 میں ہوئی۔ اس لحاظ سے یہی مناسب ہوگا کہ بھارتی کی شاعری کا تقابلی مطالعہ اقبال کی اس دور کی شاعری سے کیا جائے جو بیسویں صدی کے دوسرے دہے تک پر مشتمل ہے یعنی اقبال کا وہ کلام جو ''بانگ درا'' میں شامل ہے۔

اقبال اور بھارتی شعری افق پر سب سے پہلے ایک وطن دوست شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ دونوں نے ہندوستان کی عظمت اور اس کے شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستانیوں کی حمیت کو للکارا ہے۔ اس وجہ سے دونوں کی شاعری میں خطابت کا جو انداز پیدا ہو گیا ہے اور لفظیات کے آہنگ میں جو گھن گرج والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے وہ ان کی مشترکہ خصوصیت قرار دی جا سکتی ہے۔

بھارتی نے قومی شاعری کا آغاز بنکم چندر چٹرجی کے گیت ''بندے ماترم'' سے متاثر ہو کر کیا۔ جس طرح اس گیت نے انقلابی جذبات کو ابھارا اسی طرح بھارتی کے کلام نے بھی نوجوانوں میں انقلابی میلانات کو فروغ دیا۔ وہ کہتے ہیں:

جیت ہماری ہوگی یا ہار، یا پھر موت مگر ہم متحد رہیں گے اور یہ آواز اٹھائیں گے بندے ماترم

اقبال کو بھی اپنے وطن سے شدید محبت تھی۔ ہندوستان کی زبوں حالی اور غلامی پر وہ بھی ملول رہتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی نظم ''تصویر درد'' میں ہندوستانیوں کو خبردار کیا ہے کہ:

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

دونوں شاعروں نے سرزمینِ ہندوستاں کی عظمت کے گیت گائے ہیں ''ہمالہ'' کے عنوان سے اقبال کی جو شاہکار نظم ہے اس کے علاوہ دوسری کئی نظموں میں بھی وطن دوستی کا جذبہ رچا بسا ہے جب کہ بھارتی نے مختلف نظموں میں ہمالہ اور گنگا کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

یہ عظیم ہمالیہ ہمارا ہے
جس کا ساری دنیا میں ثانی نہیں ہے
یہ رحم دل گنگا ہماری ہے
کیا کوئی اور ندی اس کا مقابلہ کر سکتی ہے!

اقبال نے اپنی مشہور نظم ''ترانۂ ہندی'' میں ہمالہ اور گنگا کی اہمیت اس طرح بیان کی ہے۔

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا' وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو؟
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

ایک اور مقام پر دونوں شاعروں نے ہمالیہ کے تعلق سے جو تشبیہات استعمال کی ہیں ان میں اشتراک نظر آتا ہے۔ بھارتی نے ''بھارت'' کے عنوان سے اپنی نظم میں ہمالہ کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے اس پر پھیلے ہوئے برف کو چاندی سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے:

آؤ ہم چاندی سے ڈھکے ہوئے ہمالہ کی بلندی کو سر کریں

اقبال کی نظم ''ہمالہ'' کا ایک شعر ہے:

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

اقبال کو ایک سچے محبِ وطن کی حیثیت سے ملک کی قومی یکجہتی بھی عزیز تھی اور وہ ملک کی بھلائی اسی میں دیکھتے تھے کہ تمام ہندوستانی مل جل کر رہیں ان کے حسب ذیل اشعار خاص طور پر اس جذبے کے مظہر ہیں۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

(ترانۂ ہندی)

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے۔

(نیا شوالہ)

اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' اسی خیال کے گرد گھومتی ہے کہ ہم ایک ایسی نئی دنیا بسائیں جہاں مذہب اور ذات پات کا بھید بھاؤ نہ ہو۔ اسی دنیا کو انھوں نے ''نیا شوالہ'' کا نام دیا ہے یہ نظم ایک برہمن سے خطاب ہے جو واعظ کی طرح کٹھ ملائیت کی علامت ہے اقبال نے اس نظم میں ایک نئی دنیا کا خواب دیکھایا دوسرے الفاظ میں ایک جدید وسیع النظر ہندوستاں کا خواب دیکھا اور دکھایا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

بھارتی نے اپنی نظم ''بھارت'' میں قومی یکجہتی کے متعلق اسی طرح کتنے اچھوتے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کہتے ہیں:

ہم چاندنی رات میں دریائے سندھ کا سفر کریں
کیرالہ کی حسیناؤں کے ساتھ تلنگو کے شیریں گیت گائیں
کاویری ندی کے پانی کے بدلے
گنگا ندی کے گیہوں کی بالیاں خریدیں
بہادر مرہٹی شاعروں کے اعزاز میں
کیرالہ کے ہاتھی دانت کا تحفہ پیش کریں (3)

اقبال اور بھارتی کی وسیع النظری کا مظہر ان کی وہ نظمیں بھی ہیں جو انھوں نے اپنے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کے رہنماؤں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھی ہیں۔ اقبال کی نظمیں سوامی رام تیرتھ، رام اور نانک اسی کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ اسی طرح بھارتی نے بھی ''اللہ اللہ'' اور ''یسوع مسیح'' کے عنوان سے نظمیں لکھ کر دیگر مذاہب کے تئیں اپنے مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں شاعروں کا مسلک انسانیت تھا اور دونوں کو انسانی قدروں سے دلی لگاؤ تھا۔

دونوں شاعر عالمی مساوات اور بین الاقوامی اخوت کے حامی تھے، دونوں کو ایسی جمہوریت عزیز تھی جہاں بندوں کی نہیں خدا کی حکمرانی ہو۔ دونوں نے معاشی وسماجی مساوات کا خواب دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے جب 1917 میں روس میں انقلاب آیا تو دونوں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ دونوں نے انقلاب روس کا خیر مقدم کیا۔ اقبال نے کہا:

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

بھارتی نے ''نیا روس'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں وہ کہتے ہیں:

طاقتور دیوی پرا سکتی نے
روس پر نظرِ کرم ڈالی

کہ وہاں برپا ہوا ایک انقلاب
اس طرح ایک عہد نو کی بنا پڑی

ایک دوسری نظم میں سرمایہ دارانہ استحصال کی مذمت کرتے ہوئے ایک نئے عہد کی بشارت ان الفاظ میں دی:

وہ دن گئے جب کہ لوگ
برہمن کو آقا سمجھتے تھے
وہ دن گئے جب کہ لوگ
حاکموں کے آگے سر جھکاتے تھے
آؤ ہم سب مل کر پوجا کریں
زراعت ، صنعت وحرفت کی
مذمت کریں ان کاہلوں کی
پیٹ پوجا جن کا مذہب ہے (4)

اقبال اور بھارتی دونوں حسنِ فطرت کے پرستار ہیں دونوں کے ہاں قدرتی مناظر سے قلبی لگاؤ اور فطرت کے متعلق تحیر کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مناظرِ فطرت کی تصویر کشی میں دونوں شاعروں نے خارجیت اور داخلیت کے مابین امتزاج اور توازن قائم رکھا ہے جس کی وجہ سے ان دونوں کی نظموں میں پُر لطف اور پُر کیف فضا کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں بھارتی کی طویل نظم ''کوئل پاٹو'' (کوئل کا نغمہ) شاہکار قرار دی جاسکتی ہے۔ اس نظم کا مرکزی کردار خود شاعر ہے اور اس کی محبوبہ کوئل ہے جس کا مسکن آم کے باغ میں ایک گھونسلہ ہے اس کی دلنشیں آواز بجلی کی طرح سارے باغ میں کوند جاتی ہے۔ حقیقی دنیا کو بھول کر شاعر خوابوں کی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ کوئل کی آواز کا جادو بھارتی کے الفاظ میں ملاحظ ہو۔

جیسے امرت پھیل جائے ہوا کے ساتھ
جیسے بجلی کی چکا چوند نظروں کو خبر کر دے
جیسے جنت کی حوریں اپنے حسن کا جادو جگائیں
جیسے سحر انگیز نظم سب کو مسحور کر دے
مجھے جب اس کا تجربہ ہوا میں مسحور ہو گیا
میں نے ہوش کھو دیے خوابوں میں کھو گیا (5)

''بانگ درا'' میں شامل اقبال کی کئی نظمیں ان کے حسنِ فطرت کا شیدائی ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان کی ایک نظم ''کنارِ راوی'' میں بیان کردہ کیفیت بھارتی کے احساسات سے کتنی ملتی جلتی ہے:

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

جہاں تک ان دونوں شاعروں کے اسلوب کا تعلق ہے، ان میں ایک بات مشترک ہے، وہ یہ کہ دونوں ہی نے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے جن میں گھن گرج زیادہ ہے۔ دونوں کے ہاں ایک خاص قسم کا ترنم پایا جاتا ہے جو ان کی شناخت بن چکا ہے۔ اس ترنم میں جوش اور ولولے کی کیفیت دونوں کے ہاں یکساں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان دونوں کا یہ مخصوص شعری آہنگ اور لہجہ ایک تیز دھار والی تلوار کی طرح ہے جس کے ذریعے انھوں نے تخریبی قوتوں کو للکارا اور تعمیری قوتوں کو بیداری کا پیغام دیا ہے۔

بھارتی کی شاعرانہ گھن گرج کا اندازہ ان کی ایک نظم کے اس بند سے لگایا جاسکتا ہے۔

ڈرو نہیں ڈرو نہیں
ڈر کا نام و نشان نہ ہو
اگر ساری دنیا بھی
تمھارے خلاف ہو جائے
ڈرو نہیں ڈرو نہیں
ڈر کا نام و نشان نہ ہو (6)

اقبال کی شاعری اس قسم کے رجز سے بھری پڑی ہے جیسے ان کے یہ مشہور اشعار:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

بہر حال برصغیر کی دو عظیم زبانوں کے دو عظیم شاعروں کے ہاں بیسویں صدی کے اوائل میں ابھرنے والے قومی رجحانات کی جو بازگشت سنائی دیتی ہے اور دونوں کے اسلوب میں جو ہم آہنگی نظر آتی ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ زبانیں چاہیں مختلف کیوں نہ ہوں علاقائی اور مذہبی اعتبار سے ادیب ایک دوسرے سے الگ کیوں نہ ہوں لیکن ان کے درمیان ایک مشترکہ زیریں لہر ضرور کام کرتی رہتی ہے جسے قومی لہر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

حواشی:

1. بانگ درا۔ علامہ اقبال۔ ص 9، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2. سرامنیم بھارتی از پریمانند کمار مترجم حسرت سہروردی۔ ص13، ناشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔ 1990، 3. تاریخ تامل ادب از مو۔ وردا راجن مترجم حیات افتخار ص377، ناشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی- 1991، 4. ایضاً ص- 381، 5. ایضاً ص- 389، 6. ایضاً- 385

□□□

پتہ:
Dept. of Urdu, Qaid-e-Millat College,
Medwakkam, Tamil Nadu

ظہیر غازی پوری

قصیدہ — ایک فراموش شدہ صنفِ سخن

اردو زبان کی نشو و نما ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہوئی اور ہر علاقے کی زبان کے اثرات اس نے قبول کیے۔ عرب اور ایران کے دوستانہ تعلقات ہندوستان سے طلوع اسلام سے قبل بھی تھے جنھیں بعد میں مزید فروغ ملا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں فارسی بولنے والی قوم صفاری سندھ پر قابض ہوئی تو فارسی کے اثرات بھی اردو زبان پر مرتب ہوئے۔ مغلوں کے عہد حکومت میں سرکاری زبان اور دفتری زبان تو فارسی تھی ہی، اس زمانے کے رئیسوں اور امیروں کی زبان بھی فارسی تھی۔ لہٰذا عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی بیشتر شعری اصناف اردو کو وراثت میں حاصل ہوگئیں۔

انھی اصنافِ سخن میں سے ایک قصیدہ بھی ہے جو عرب میں بیحد مقبول تھا۔ قصیدے کو فارسی زبان میں بھی فروغ حاصل ہوا اور یہ براہِ فارسی اردو میں داخل ہوا۔ ''لغات فارسی'' میں قصیدے کے معنی موٹا، دبیز، گورا، مغز مندرج ہیں نیز یہ بھی کہ شاعروں کی اصطلاح میں قصیدہ وہ نظم ہے جو کسی کی تعریف یا برائی میں ہو اور اس میں پندرہ بیت سے کم نہیں ہوتے۔ ''نور اللغات'' جلد سوم میں اس کے لغوی معنی کے علاوہ اصطلاحی معنی کی وضاحت ان لفظوں میں کی گئی ہے:

''قصیدہ ان اشعار کا نام ہے جن میں کسی کی ہجو، مدح یا وعظ و نصیحت یا تعریفِ بہار یا شکایتِ روزگار وغیرہ مضامین بیان کیے جائیں۔ قصیدے کے پہلے دونوں مصرعوں اور ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں قافیہ ہونا ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب ''درسِ بلاغت'' میں شمیم احمد نے قصیدے کے حوالے سے لکھا ہے:

''ہیئتی نقطۂ نظر سے قصیدے کی اہمیت اس بات میں بھی مضمر ہے کہ غزل جیسی شاندار صنفِ سخن اسی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ لہٰذا اس کی ہیئت بڑی حد تک وہی ہے جو غزل کی ہیئت ہے۔ قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں گاڑھا مغز۔ اس صنفِ سخن پر اس لفظ کا اطلاق اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ یہ اپنے نادر و بلند اور پرشکوہ مضامین کی وجہ سے تمام اصنافِ سخن میں فوقیت رکھتی ہے۔ اس لیے اسے اصنافِ سخن میں وہی حیثیت حاصل ہے، جو انسانی جسم میں مغزِ سر کو حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے مغزِ سخن تصور کر کے قصیدے کا نام دیا گیا ہے۔ لفظ قصیدہ کی ایک توجیہہ یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ لفظ، لفظِ ''قصد'' سے مشتق ہے اور شاعر جب کسی کی مدح یا ذم کے اشعار کہتا ہے تو اس کے قصد اور ارادے کو دخل ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر گیان چند نے ''اردو نظم اور اس کی اصناف'' میں لکھا ہے کہ —

''اردو میں قصیدہ ہیئتی موضوعی صنف ہے۔ عربی میں صرف ہیئتی تھی۔ قصیدے کی شاعری کا معیار بہتر ہوتا تھا، موضوع کی کوئی قید نہ تھی۔ عربی میں شاعری کی گروہ بندی ہیئت کی بنا پر نہیں موضوع کی بنا پر کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں شمیم احمد کا بیاں زیادہ واضح، صاف اور معروضی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''اردو میں مروج اصنافِ سخن میں قصیدہ بھی مثنوی کی طرح ایک ایسی صنف ہے جس کی صنفی شناخت کے لیے اس کے موضوع اور ہیئت کو مساوی حیثیت حاصل ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کے فقدان سے یہ صنف اپنی شناخت کھو دیتی ہے بلکہ یہ صورت قصیدے میں مثنوی کی بہ نسبت زیادہ پائی جاتی ہے۔''

گویا قصیدے کی ہیئت بھی اہم ہے اور موضوع بھی۔ قصیدہ مدحیہ ہوتا ہے اور ہجویہ بھی۔ قصیدے کی ہیئت غزل سے مماثلت رکھتی ہے۔ قدیم زمانے میں موضوعات (مدح و ہجو تک) محدود تھے۔ جدید عربی ادب (تالیف ڈاکٹر شوقی ضیف) کے مطالعے سے دورِ جاہلیت کے شعرا سے متعلق یہ معلومات فراہم ہوتی ہیں کہ:

''جاہلی شعرا میں زہیر کو امید و رجا یعنی مدح گوئی میں، نابغہ ذبیانی کو خوف یعنی معذرت خواہی میں، اعشیٰ قیس کو مستی یعنی مدح یا ہجو میں، امراء القیس کو سواری یعنی گھوڑ سواری اور اونٹنی کی تعریف و تحسین میں دیگر شعرا پر امتیاز و تفوق حاصل ہے..... ان شعرا کے قصائد اور اشعار کے ذریعے جاہلی ادب نے ارتقا کے منازل طے کیے..... انھوں نے جاہلی ادب کی تعمیر و تزئین میں بھرپور حصہ لیا۔ خطابت ایک ایسا فن ہے جو دورِ جاہلیت میں ارتقا کی منزلیں چھو رہا تھا..... جس کے ذریعے ہر قبیلہ اپنی عظمت اور شان و شوکت کی ترجمانی اور دفاع کرتا..... قدیم خطبا میں کعب بن لوی اور ان کے بعد کے ادوار میں قیس بن خارجہ، خویلد بن عمر الغطفانی، قیس بن ساعدہ الایادی، اکثم بن صیفی اور عمر بن معدی کرب کے اسما بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔''

(مترجم: شمس کمال انجم، ص18-19)

زمانۂ جاہلیت میں بعض قصیدہ گو اپنی بیویوں کے حسن و جمال کا تذکرہ مبالغے کے ساتھ فحش اور عریاں انداز میں کیا کرتے تھے۔ بعض عربی شعرا کو یہ

کمال بھی حاصل تھا کہ وہ جس کی ہجو لکھ دیتے تھے اسے معاشرے میں ذلیل سمجھا جانے لگتا تھا اور جس کی تعریف وتوصیف کر دیتے تھے اسے معزز تسلیم کر لیا جاتا تھا اور اس کے خاندان کی لڑکیوں سے شادی کرنا لوگ باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

قصیدہ براہ فارسی دیارِ اردو میں داخل ہوا۔ فارسی میں بہار وخزاں، گردشِ دوراں، علم وحکمت، اخلاق ومعاشرت اور پند ونصیحت کے موضوعات پر قصائد لکھے گئے تو اردو زبان میں شہدائے کربلا، ائمہ کے مناجات، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، کے اوصاف کے علاوہ تضحیک روزگار اور شکایتِ زمانہ، جیسے موضوعات پر بھی قصیدے تحریر کیے گئے۔ قصیدہ اور مثنوی میں واضح فرق یہ ہے کہ مثنوی ایک طویل منظوم کہانی کی حیثیت رکھتی ہے جس کا انداز بیان سادہ ہوتا ہے جبکہ قصیدے کا انداز خطابتی اور گھن گرج والا ہوتا ہے۔ تعداد اشعار بھی کم ہوتی ہے۔ قصیدے کے ابتدائی اشعار کو تشبیب (اور نسیب بھی) کہتے ہیں۔ تشبیب میں متغزلانہ اظہار مروج رہا ہے۔ دوسرے حصے کے اشعار کے لیے گریز کی اصطلاح مستعمل رہی ہے۔ اس میں شاعر تشبیب سے مدح یا ہجو کو اس طرح مربوط کرتا ہے کہ روانی میں خلل نہ پڑنے پائے۔ گریز قصیدے کا ایک لازمی عنصر ہے۔ اس کی عدم موجودگی قصیدے میں ’’مقتضب‘‘ کا عیب پیدا کر دیتی ہے۔ قصیدے کے تیسرے حصے میں ہجو یا مدح کا بیان ہوتا ہے اور چوتھے حصے میں اظہار اور عرض مطلب کے بعد شاعر ممدوح کے لیے دعائیہ اشعار تخلیق کرتا ہے۔ اس طرح ایک اثرانگیز قصیدہ تکمیل کو پہنچتا ہے قصیدہ قدرت زبان وبیان اور لب ولہجہ کی امتیازی شان کے باعث دوسری اصناف پر بلاشبہ فوقیت رکھتا ہے۔

قصیدے کے اشعار کی کم سے کم تعداد سات بتائی گئی ہے۔ سات اشعار میں صرف مدح یا ہجو بیان کی جاسکتی ہے۔ اس نوعیت کے قصیدے خطابیہ کہے جاتے ہیں۔ جن قصیدوں میں تشبیب، گریز، مدح اور مدعا ودعا کے اجزا فنی التزام کے ساتھ موجود ہوں، انھیں تمہیدیہ کہا جاتا ہے۔ ایسے بیشتر قصائد مدحیہ ہوتے ہیں۔ ہجویہ قصیدے میں چونکہ کسی کی ہجو، طعن وتشنیع، یا مکروہاتِ زمانہ کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، اس لیے ان میں مدح، عرض مدعا اور دعا کے شعر نہیں کہے جاتے۔

کتابوں میں قصیدے کے کم سے کم اشعار کی تعداد سات سے پندرہ تک اور زیادہ سے زیادہ تعداد پچیس متعین کی گئی ہے لیکن اس تعین کا کوئی شاعر پابند نہیں رہا۔ غالب کے قصیدۂ حیدری میں تعداد اشعار ایک سو دس ہے۔ قصیدہ در مدح سراج الدین محمد بہادر شاہ کے اشعار کی تعداد اٹھاون ہے۔ ان کا ایک قصیدہ جو منشی شیونرائن کی طرف سے مسٹر ایلن برا کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی مبارکباد پر لکھا گیا تھا، وہ صرف اکیس اشعار پر مشتمل ہے۔ شاطر مدراسی نے ایک قصیدے میں 1396 اشعار کہے تو علی حیدر نے سات قصائد پر مشتمل (ہفت خواں) قصیدہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وحیات سے متعلق رقم کیا۔ لہٰذا یہ باور کیا جانا چاہیے کہ قصیدہ بھی مثنوی کی طرح طویل سے طویل تر ہوسکتا ہے۔

اردو کے ان تمام شعرا نے قصیدے لکھے ہیں جو قادرالکلام تھے اور فکر وفن دونوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کو اسلامی اور قرآنی فکر کا شاعر قرار دیا جاتا ہے لیکن انھوں نے بھی نواب بھاول پور عباسی پنجم کی صدر نشینی کے موقعے پر 48 اشعار پر مشتمل قصیدہ لکھا تھا اور مہاراجہ کشن پرساد کی مدحت میں بھی 39 اشعار کہے تھے۔

دکن کے شعرا میں حضرت سید شاہ عبداللطیف ذوقی ویلوری، حضرت باقر آگاہ اور شاہ عبدالحیٔ احقر بنگلوری نے بھی قصیدے لکھے۔ قدیم شعرائے دکن میں بے شمار شعرا نے قصیدے کہے ہیں۔ تفصیل کا یہ محل نہیں۔ لیکن ہمارے عہد کے شعرا کی سہل پسندی اور بے توجہی نے مثنوی اور قصیدہ کی طرف اعتنا نہیں کیا۔ صنفِ قصیدہ اتنی اہم ہے کہ اس کے بطن سے غزل جیسی ہر دلعزیز صنفِ شاعری وجود میں آئی لیکن قصیدہ ناقدری کا شکار ہوگیا۔

ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی نے ’’اردو قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ‘‘ میں لکھا ہے کہ — ’’ولی نے اپنے اخلاف کو غزل کی زبان کے ساتھ قصیدے کی بھی زبان دی..... غزل میں نرم اور لطیف زبان استعمال کی جاتی ہے اور قصیدے میں پرشکوہ۔ غزل کی زبان میں محبوبیت ہوتی ہے اور قصیدے کی زبان میں مجاہدانہ آن بان‘‘ — غزل کا شعری قد وقامت ہر عہد میں بلند وبالا رہا ہے اور یہ مخالفت کے زخم کھا کر بھی تازہ دم اور تازہ کار رہی ہے۔ اگر قصیدہ نگاری کو از سر نو رواج دینے کی سعی پیہم ہو، قادرالکلام شعرا اپنے قلمِ گوہر رقم کا رخ اس جانب موڑ دیں اور مدیرانِ رسائل قصائد کو اہتمام سے شائع کریں تو اس صنفِ سخن کو دوبارہ فروغ حاصل ہوسکتا ہے۔ قصیدے کی تجدید سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ طویل نظمیں لکھی جائیں گی اور دوسرا یہ کہ غزل کو اور زیادہ تقویت حاصل ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ قصیدہ وغزل کی ہم نشینی ادب میں اپنی جگہ بہ آسانی بنا لے گی۔

□□□

پتہ:
"Baitul Adab"
Hashmia Colony,
Hazaribagh-82530
(Jharkhand)

عارف عثمانی

حبیب تنویر زندگی کا آخری ڈراما کھیل گئے

ممتاز ڈراما نگار، شاعر، ادیب اور اداکار پدم بھوشن حبیب تنویر 8 جون کو صبح کے ساڑھے چھ بجے حرکت قلب بند ہونے سے بھوپال کے ایک اسپتال میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ 86 برس کے تھے۔ جناب حبیب تنویر پچھلے ایک ماہ سے اسپتال میں داخل تھے۔ پہلے ان کی صحت کچھ بہتر ہوئی لیکن بعد میں بگڑتی ہی چلی گئی۔

ہندوستانی تھیئٹر کے آسمان پر چمکنے والا وہ ستارہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہیں کھو گیا۔ یہ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ صدیوں میں کوئی ایسا شخص پیدا ہوتا ہے جو اپنے پورے عہد کی نمائندگی کرتا ہو۔ جس کے نہ رہنے پر یہ محسوس ہو، ایک عہد ہی ختم ہوگیا۔

حبیب تنویر دیکھنے میں بالکل سیدھے سادے ہندوستانی تھے مگر ان کے ہندوستانی جسم میں ایک ایسی بے چین روح تھی جو پوری انسانیت کا کرب اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔ ذہین سوچتی ہوئی آنکھیں اور کشادہ پیشانی اور پھر ان کی آواز، جو سات پردوں میں بھی پہچانی جاسکتی تھی۔ اس آواز کا دم خم کبھی کم نہ ہوا۔ بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ آواز اور بھی بااثر ہوتی گئی۔

کون ہوگا جو انھیں نہیں جانتا، چاہے وہ ان کے تھیٹر کے حوالے سے ہو یا ادیب کی حیثیت سے، یہی وجہ ہے کہ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد سے ایک خلا سا محسوس ہو رہا ہے۔

حافظ محمد حیات خاں کی چار لڑکیاں اور تین لڑکے حمید احمد خاں، ظہیر احمد خاں اور حبیب احمد خاں تھے۔ حبیب احمد خاں دونوں بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ تقسیم ہند کیبعد بے شمار خاندان صبح نو کی امید لیے پاکستان ہجرت کر رہے تھے لیکن حبیب تنویر نے اپنے والد اور اعزا کے اصرار کے باوجود اپنا وطن چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ انھوں نے یہیں رہتے ہوئے اپنی دنیا آپ تعمیر کی۔ حبیب احمد خاں، جو حبیب تنویر کے نام سے مشہور ہوئے یکم ستمبر 1923 کو رائے پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر اور مدرسے میں ہوئی۔ 1940 میں میٹرک پاس کیا اور 1944 میں مارس کالج ناگپور سے بی اے کیا 1945 میں اردو میں ایم اے کرنے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہنچے۔ مگر ان کی بے چین طبیعت نے انھیں علی گڑھ میں زیادہ رہنے نہ دیا۔ اور انھوں نے ممبئی کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔

ممبئی میں ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نکھرنے کے مواقع ملے۔ لیکن تلاش معاش میں ممبئی کی پر پیچ راہوں پر بھٹکنا گویا حبیب تنویر کا مقدر سا بن گیا تھا۔ اسی اثنا میں ان کی فلم ڈائرکٹر سوریم سے ملاقات ہوئی اور حبیب تنویر فلم ''آپ کے لیے'' میں بحیثیت ہیرو منتخب ہوگئے۔ فلم پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی لیکن ڈائرکٹر اور پروڈیوسر کے درمیان قضیے کی وجہ سے ریلیز نہ ہوسکی۔ حبیب تنویر پھر تلاش روزگار میں سرگرداں ہوگئے۔ ایک فیکٹری میں سپروائزری بھی کی۔ اسی دوران ان کی ملاقات ذوالفقار احمد بخاری صاحب سے ہوئی انھوں نے ان کی آواز لہجے اور شائستگی کو دیکھتے ہوئے آل انڈیا ریڈیو ممبئی میں لے لیا۔ اور انھیں بچوں اور خواتین کے پروگرام سے لے کر ڈرامے، فیچر، فلم ریویو کی ذمے داری سونپ دی اور یہ ہی موڑ ان کی زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ یہاں ان کی ملاقات بہت سی اہم شخصیات سے ہوئی جن میں سے ایک بابو راؤ پٹیل بھی تھے۔ جن کے انگریزی ماہنامے ''فلم انڈیا'' میں تنویر صاحب نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کا کام کیا۔ اور یہ ان کے لیے صحافت کا پہلا زینہ تھا۔ ممبئی میں 1948 سے 1954 تک اپنے قیام کے دوران وہ اداکار اور ہدایت کار کی حیثیت سے ابتا سے بھی وابستہ رہے۔

اس وقت تک اردو ادب میں ڈراما نگاری کے فن کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل نہیں تھی ہاں ایک Folk کلچر کی شکل میں ڈراما ہندوستانی سماجی زندگی میں الگ الگ انداز میں موجود تھا مثلاً پربھات بھیری، یا رام لیلا، نوٹنکی، وغیرہ 1954 میں حبیب تنویر نے دہلی میں پروفیشنل تھیٹر ''ہندوستانی تھیئٹر'' کی بنیاد رکھی۔ 1955 میں اس فن سے مزید آگاہی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ''رائل اکادمی آف ڈرامائک آرٹس'' لندن اور ''برسٹل اولڈوک تھیٹر اسکول کا مشاہدہ کیا اور واپس آنے پر 1956 میں پہلے ہندوستانی تھیٹر کے لیے ڈراما ''مٹی کی گاڑی'' پیش کیا۔ 60 کے دہے میں بھوپال میں نیا تھیٹر کی بنیاد ڈالی جس نے بعد میں بہت مقبولیت حاصل کی۔

حبیب تنویر نے اپنے 72 اسٹیج ڈراموں میں سے 52 ڈرامے خود ڈائریکٹ کیے۔ ان کے 72 اسٹیج شدہ ڈراموں میں سے 25 ڈرامے حبیب تنویر طبعزاد ہیں۔ ان 25 ڈراموں میں 10 ڈرامے اردو میں، 7 ڈرامے ہندی میں 7 ڈرامے چھتیس گڑھی میں اور ایک ڈراما انگریزی میں ہے۔

پریم چند کی کہانی پر مبنی ڈراما ''شطرنج کے مہرے'' اور ''چرن داس چور'' ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ ان پر انھیں کئی اعزازات بھی ملے۔ 1954 میں ان کے 7 ڈرامے منظرِ عام پر آئے جن میں آگرہ بازار، دودھ کا گلاس، چاندی کا چمچہ، ہر موسم کا کھیل، آگ کی گیند، گدھے کا رتوس اور 1961 میں رجیہ چمپا اور چار بھائی وغیرہ

حبیب تنویر کی تھیئٹریکل لائف کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا دور 54-1945 تک قیامِ ممبئی ہے، جسے ابتدائی جدوجہد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، دوسرا دور 1996-1954 تک قیامِ دہلی کا زمانہ جس میں انھوں نے ڈرامے کی شاہراہ پر یکے بعد دیگرے سنگہائے میل قائم کیے اور بلندیوں کو چھوا، تیسرا دور 1996 سے بھوپال میں قیام ہے۔

حبیب تنویر! صوبائی سطح سے لے کر قومی سطح تک کے اعزازات، پدم بھوشن، راجیہ سبھا کی رکنیت، ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں، متعدد یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر، فیلوشپس اور ''لیجنڈ آف انڈیا ایوارڈ'' (Legend of India Award) کے علاوہ 21 نومبر 2004 میں شریمنت شنکر دیو پُرسکار (آسام) سے سرفراز ہوئے۔

حبیب تنویر ایک ایسے انسان تھے جو ہزاروں انسانوں کے جسم میں بستے تھے۔ یا یوں کہا جائے کہ انسان کے ہر ایک روپ میں رہ کر وہ خود کو محسوس کرنا چاہتے تھے۔ ان کا ہر ایک ڈراما، ان کی سوچ کے وسیع کینوس کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ہندوستانی مٹی میں پیدا ہوئے اور مٹی کا حق ادا کر گئے۔

زندگی کی بساط پر شطرنج موہروں کی طرح چال چلتا اور مات کھاتا ہوا انسان، حبیب تنویر نے ہی تخلیق کیا۔ ان کے ڈراموں میں سادہ زبان میں، سادہ گفتگو، روزمرہ کی زندگی میں آنے والے رونے اور ہنسنے کے چھوٹے چھوٹے موقعے، ہندوستان کے رسم و رواج، بول چال، تہذیب و تمدن اور ان کا مرکزی کردار ''آدمی''۔ یہی وجہ تھی کہ آگرہ بازار نے جو مقبولیت حاصل کی وہ شاید ہی کسی اور ڈرامے نے حاصل کی ہو۔ آگرہ بازار دراصل نظیر اکبر آبادی (1830-1735) کی تخلیقی اور فکری جمالیات کو ایک ایسا نرالے انداز میں پیش کرنے کی کوشش ہے جس میں حبیب تنویر نے نظیر اکبرآبادی کو زندہ جاوید بنا دیا۔

نظیر کو اردو نظم کا باوا آدم قرار دیتے ہوئے حبیب تنویر ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''نظیر سے پہلے اردو میں غزل، قطعہ، ہجو، قصیدہ، مثلث، مخمس، مسدس، مثنوی، نعت، مرثیہ یہ سب اصناف تو موجود تھیں لیکن جسے نظم کہیں ویسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس لحاظ سے نظیر اردو نظم کے باوا آدم ہیں۔ یعنی وہ صنف جسے بعد میں اقبال، جوش اور ان کے بعد اردو کے نئی نسل کے نئے شاعروں نے نکھارا۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے ایسے ایسے مضمون نظیر نے اپنی نظموں میں قلمبند کیے ہیں جن کی طرف کبھی کسی شاعر کی نظر بھی نہ گئی۔ نہ نظیر سے پہلے نہ نظیر کے بعد۔ اور اگر نظر جاتی تو نظیر کی نظموں کے موضوعات پر قلم اٹھانا آسان بھی نہ تھا۔ نظیر کے یہاں شعر کا دریا تھا جو بے ساختہ بہے جا رہا تھا۔ ورنہ ککڑی، برتن، تربوز، لڈو جیسے مضامین پر اس کمال کی خیال آرائی کہاں ممکن تھی۔''

اردو زبان میں اردو تھیئٹر کے مستقبل کے بارے میں ان کی فکر واضح تھی۔ انیس اعظمی کے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ:

''مجھے فی الحال اردو اسٹیج ختم ہوتا نظر نہیں آرہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اردو دبنے کے باوجود اور زور سے پنپ رہی ہے اور پھیل رہی ہے۔ اگر اس طرح کی کوششیں جاری ہیں اور ذرا سی سرکاری مدد مل گئی، سرکاری جو لسانی پالیسی ہے اس کے بل پر ملازمتیں ملنے لگیں اور آگے چل کر علاقے یا صوبے کی وہ پہلی زبان مانی گئی تو بہت بڑا سہارا ملے گا۔ بہرحال اردو کچھ نہ کچھ پنپ رہی ہے اور امید کرنی چاہیے کہ پنپتی رہے گی۔''

(اردو تھیئٹر۔ کل اور آج۔ مرتبین مخمور سعیدی، انیس اعظمی، 1995، ص104)

آگرہ بازار میں آدمی اور آدمی سے جڑی فطرتوں کا ایسا برملا اظہار کیا گیا کہ بے ساختہ منہ سے واہ نکل جاتی ہے۔ ایک ککڑی بیچنے والا بھی نظیر اکبر آبادی کی نظم کے اس مصرعے سے فیض یاب ہو رہا ہے اور گاگا کے ککڑیاں بیچتا ہے کہ ''لیلیٰ کی انگلیاں ہیں'' بغیر کھائے ہی ککڑیوں کی لذت بڑھ جاتی ہے۔ آدمی کے الگ الگ Moods کو ایک بے حد آسان انداز میں پیش کرنا، کہ دیکھو تو اچھا لگے سنو تو کانوں کو بھلا محسوس ہو اور اگر غور کیا جائے تو فکر کا نقطہ بھی مل جائے یہ ہنر صرف اور صرف حبیب تنویر کا ہی ہوسکتا ہے۔ حبیب تنویر نے شہری شعور، ماڈرن شعور کے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھا مگر انھوں نے اصل ہندوستان گاؤں میں بستا ہے'' اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کیا بلکہ اپنے فن اور عمدہ پیش کش کے ذریعے لوگوں کو اپنا مرید بنالیا۔ وہ اپنے آپ میں چلتا پھرتا ادارہ تھے۔ ایک ہی ذات میں جیسے پوری دنیا سمٹ گئی ہو۔ اور ان کا خود کا مزاج بھی یہ تھا کہ وہ دنیا میں خود کو، اور خود میں دنیا کو سمیٹنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے خود کو صرف اردو تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ ہندی، انگریزی، چھتیس گڑھی میں بھی ڈرامے لکھے۔ انھوں نے پہلے خود کو مٹی سے جوڑا اور پھر اسی مٹی سے بنے عام آدمی سے اسی کی زبان میں باتیں کیں اور یہی سادگی، ذہنی کشادگی اور فطرت سے ہم آہنگی ان کے ڈراموں کی خصوصیت بن گئی۔ نظیر اکبرآبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' کو آگرہ بازار بنا کر حبیب تنویر نے دو مختلف صنفوں کو یکجا کیا۔

اگر آدمی کو دیکھیں تو وہ ایک سماجی جانور ہے جبکہ بازار خرید و فروخت کی جگہ ہے۔ آدمی جیتی جاگتی شے ہے اور بازار ایک مادی وجود ہے۔ آدمی کے ہونے سے بازار ہے بازار کے ہونے سے آدمی نہیں لیکن حبیب تنویر آدمی کی عادتوں اور فطرت کی وضاحت بازار میں علاقائی زبان اور علاقائی ماحول کے ساتھ موسیقی کے ذریعے پیش کی ہے اور آج بھی اس آدمی سے ہم خود کو جڑا پاتے ہیں آج بھی آگرہ بازار کا وہ آدمی کہیں نہ کہیں ہم سے جڑا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نظیر، تنویر اور آگرہ بازار ہم سے الگ نہ ہو سکے ہیں نہ کبھی ہو پائیں گے۔ وہ ہمارے بیچ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی موڑ پر ہم سے ملتے رہیں گے۔

ذیل میں حبیب تنویر صاحب کے اردو، ہندی اور چھتیس گڑھی اور انگریزی میں لکھے ہوئے ڈراموں کے نام اور انھیں اسٹیج کیے جانے کے برسوں کی تفصیل دی جارہی ہے جو حبیب احمد صاحب کے مضمون ''حبیب تنویر ایک زندہ داستان'' (مطبوعہ ''اردو دنیا'' نومبر 2008) سے ماخوذ ہے۔

اردو ڈرامے	اسٹیج کیے جانے کا سال	نوعیت
1. آگرہ بازار	1954	طبع زاد، دہلی
2. دودھ کا گلاس	1954	طبع زاد، دہلی
3. چاندی کا چمچہ	1954	طبع زاد، دہلی
4. ہر موسم کا کھیل	1954	طبع زاد، دہلی
5. آگ کی گیند	1954	طبع زاد، دہلی
6. گدھے	1954	طبع زاد، دہلی
7. کارتوس	1954	طبع زاد، دہلی
8. راجیہ چمپا اور چار بھائی	1961	طبع زاد، دہلی
9. دیکھ رہے ہیں نین	1992	طبع زاد، دہلی
10. ایک عورت ہیپشیا بھی تھی	1999	طبع زاد، دہلی

ہندی ڈرامے

1. شانتی دوت کامگار	1953	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، ممبئی
2. پرم پرا	1954	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، ممبئی
3. کشتیا کی چپراسی	1940	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، ممبئی
4. سوتر دھار	1964	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، ممبئی
5. ہرما کی امر کہانی	1985	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، ممبئی
6. کیس نمبر 432	1990	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، ممبئی
7. ڈیڈی کا گھر	1995	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، ممبئی

چھتیس گڑھی میں لکھے ہوئے ڈرامے

1. اندر لوک سبھا	1971	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، دہلی
2. گاؤں کا نام سسرال	1973	طبع زاد، نکّڑ ناٹک رائے پور
3. بہادر کلارن	1978	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، دہلی
4. سون ساگر	1981	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، دہلی
5. منگلو دیدی	1984	طبع زاد، نکّڑ ناٹک جانجگیر، بلاسپور، چھتیس گڑھ
6. سڑک	1994	طبع زاد، نکّڑ ناٹک پینڈرا روڈ، بلاسپور، چھتیس گڑھ
7. سن بہری	2000	طبع زاد، نکّڑ ناٹک، رائے پور

حبیب احمد صاحب نے جناب حبیب تنویر کے ان ڈراموں کے نام بھی لکھے ہیں جو دوسرے مصنفین کی کہانیوں سے ماخوذ ہے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے

عنوان کہانی	مصنف	نوعیت
1. شطرنج کے مہرے	پریم چند	اردو
2. خودکشی	دوستووسکی	اردو، ایکانکی
3. سات پیسے	دوستووسکی	چیک کہانی، اردو
4. ٹھاکر پرتپال سنگھ	وجے دان دیتھا	ہریانوی
5. چرن داس چور	وجے دان دیتھا	چھتیس گڑھی
6. دیوی کا وردان	وجے دان دیتھا	چھتیس گڑھی
7. موٹے رام کا ستیہ گرہ	پریم چند	ہندوستانی

حبیب تنویر صاحب نے پانچ ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا تھا جو یہ ہیں:

عنوان ڈراما	مصنف	زبان
1. تمباکو کے نقصانات	انتون چیخوف	اردو
2. مٹی کی گاڑی	شدرک	ہندی
3. شاجاپور کی شانتی بائی	برتولت بریخت	ہندوستانی
4. کامدیو کا اپنا بسنت رتو کا سپنا	ولیم شیکسپیئر	اردو، چھتیس گڑھی
5. +زہریلی ہوا	راہل ورما	ہندوستانی

□□□

پتہ:
G-63, Muradi Road, Batla House,
Jamia Nagar, New Delhi-25

فیاض رفعت

قمر رئیس جیسا میں نے انھیں دیکھا

قمر رئیس سے باون برس پرانی ملاقات تھی میں علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ سائنس کا طالب علم تھا۔ شہر سے یونیورسٹی آتا تو شمشاد مارکیٹ کا پھیرا ضرور لگتا۔ جہاں مصاحب علی خاں قمر رئیس نے ایک مختصر سے کمرے میں تحقیق و تخلیق کی دھونی رما رکھی تھی۔ ''پریم چند کے ناولوں کا تحقیقی مطالعہ'' ان کی پی۔ایچ۔ڈی۔ کی تھیسس کا موضوع تھا۔ قبلہ رشید احمد صدیقی ان کے نگراں تھے۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جامعہ اردو کی شبینہ کلاسوں میں محمود الٰہی اور تنویر علوی کے ساتھ قمر رئیس بھی دیکھے جاتے تھے۔ جامعہ ہی کے مجلّے ''ادیب'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔

میں نے اور عارف مارہروی نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ عشرت امیر اور رفیق شاہین بھی تیکھی روشنائی سے چھپنا شروع ہوگئے تھے۔ اکثر قمر صاحب کے یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ وہ ہماری چیزیں بڑے استغراق سے سنتے اور پڑھتے اور جہاں ضروری سمجھتے اصلاح بھی کرتے جاتے۔ انھی دنوں جانے جی میں کیا سمائی کہ افسانہ لکھتے لکھتے ہم نے آغا حشر کشمیری پر ایک مضمون لکھ ڈالا۔ ہوا یوں تھا کہ اپنے زمانے کے مشہور ڈراما نویس کنور یٰسین علی خاں شہاب برنی ہمارے گرو جی تھے اور ہمیں ان کا قرب حاصل تھا۔ وہ آغا حشر کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے اور اکثر ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالتے رہتے تھے۔ وہی سب باتیں ہم نے مضمون میں لکھ ڈالیں اور زیب داستان کے لیے کچھ اپنی طرف سے بھی اضافے کردیے۔ قمر صاحب کو مضمون سنایا۔ سن کر بہت خوش ہوئے اور جہاں تہاں قلم لگا کر اسے ادیب علی گڑھ میں شائع کردیا۔ یہ مضمون ''افکار'' کراچی میں بھی شائع ہوا۔ پھر تو ہمیں ایسا چسکا لگا کہ ایک کے بعد ایک ہمارے کئی مضمون رسائل کی زیب و زینت بنے۔ گویا کہ ہمیں مضمون نویس بنانے کا سہرا قمر صاحب کے سر بندھتا ہے۔

قمر صاحب کا عالمی ادب کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ روسی ادبیات کے وہ ماہر تھے۔ تسکین .... گورکی، چیخوف اور طالسطائی کے فکر و فن پر وہ بے تکان گھنٹوں باتیں کرسکتے تھے۔ دستووسکی کا شہرہ آفاق ناول ''جرم و سزا'' انھوں نے ہی ہم سے پڑھوایا تھا۔ ہندی اور سنسکرت شعریات پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ انگریزی اور ہندی سے نہایت رواں ترجمہ کرتے تھے۔

پریم چند شناسی سے اپنی خصوصی دلچسپی کے پیش نظر ہندی ماہنامہ ''ہنس'' میں مطبوعہ پریم چند کے بیشتر مضامین کا ترجمہ'' قمر صاحب نے خود کیا اور ایک مضمون مجھے بھی اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے دیا۔ مضمون کا عنوان تھا۔ ''زندگی میں ادب کا مقام''۔ مجھے گمان تھا کہ میں بہت اچھا مترجم ہوں۔ قمر صاحب نے دو ڈرافٹ مسترد کرنے کے بعد تیسرا ڈرافٹ برائے اشاعت قبول کیا۔ وہ محنت شاقہ میں یقین رکھتے تھے اور دوسروں سے بھی آنکھوں کا تیل نکلوا کر ہی دم لیتے تھے۔ بھلے سے آپ برا مان جائیں وہ ادب میں مصلحت کوشی اور منہ دیکھی کے قائل نہیں تھے۔ یوں وہ نہایت خوش خلق خوش طبع اور خوش ادا شخص تھے۔ دوستوں پر جان چھڑکتے تھے۔ شاگردوں میں جینے کا حوصلہ پیدا کرتے تھے۔ ان کا دل بڑھاتے تھے۔

دلی میں قیام کے دوران میں اکثر قمر صاحب کے یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ ان دنوں ان کی رہائش ماڈل ٹاؤن میں تھی۔ ایک دن شام کو میں حسب معمول بغیر کسی پیشگی اطلاع کے پہنچا تو دیکھا کہ ڈرائنگ روم میں کوئی میلا کچیلا سا شخص آرام سے صوفے پر نیم دراز اور قمر صاحب اس کی خاطر تواضع میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے بڑے اہتمام سے چائے بنا رہے ہیں۔ یہ افلاس زدہ مگر اصول پسند کمیونسٹ ادیب تاجور سامری تھے۔ اردو میں ایک رسالہ نکالتے تھے جو طبقاتی ناہمواریوں کے خلاف جہد مسلسل کا نقیب بن گیا تھا۔ سامری صاحب کے لیے قمر رئیس کے دل میں کتنا احترام تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے ان پر ایک خاکہ لکھا جس کے تاثر کا یہ عالم تھا کہ اسے پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

قمر صاحب ضدی طبیعت کے آدمی تھے۔ والد کی خواہش کے احترام میں انھوں نے وکالت کی ڈگری تو حاصل کرلی مگر ان کا دل تو زلف گرہ گیر میں الجھا ہوا تھا لکھنؤ کی مشک بار ادبی فضا نے نہ صرف انھیں سخن آشنا کیا عشق کے آداب بھی سکھلائے۔ یہی بے محابا عشق انھیں علی گڑھ لے آیا۔ جہاں بادۂ شبانہ کی سرمستیاں بھی تھیں اور رومان پرور ادبی فضا بھی۔

ان کا عشق محض جسمانی اور لمسیاتی نہیں تھا اس میں روح کی تابانی اور تازگی بھی شامل تھی۔ ایک ایسی ماورائی شادابی جو ہمارے وجود کی تطہیر کا باعث ہوتی ہے۔ میں نے انھیں عالم مدہوشی میں بارہا دیکھا۔ ان پر ایک عجب سی وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ ان کا چہرہ تمتما جاتا تھا۔ وہ ایک عجب سے عالم جذب میں پیہم رواں زندگی کی نصرتوں کے بیان کے ساتھ ساتھ زندگی بے مائیگی اور بے ثباتی کو بھی موضوع سخن بناتے کہ گوشِ برآواز قاری رنج و محسن کی

سوگوار بدلیوں میں خودکو گم پاتا۔

زندگی کے آخری پڑاؤ سے گزرتے ہوئے قمر رئیس نے اپنا پہلا مجموعۂ کلام ''شام نوروز'' ترتیب دیا۔ یہ مجموعہ ان کے پچپن سالہ شعری شعر کا حاصل ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی ''یہ ایک ایسا انتخاب ہے جس میں سرخوشی اور ملال کے جملہ زاویے بے کم وکاست پیش کر دیے گئے ہیں۔''

قمر صاحب کا شعری مجموعہ بہت قبل شائع ہونا چاہیے تھا کہ بہر طور تخلیق کا درجہ تنقید سے بڑا ہوتا ہے کاروبار تمنا سے روگردانی کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ غالباً زندگی کی آسودگیوں اور فراغتوں کی تلاش میں شاعر ایک ایسے آفاق میں گم ہوگیا جہاں سرمدی نغموں کی لے مدھم ہوتی چلی گئی۔

علی گڑھ میگزین 1957 میں میں نے ان کی ابتدائی نظم ''شب چراغ'' پڑھی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا آخری بند مجھے ملال سے آشنا کر دیتا ہے۔

پھر وہی سوچ کہ جینے کے بہانے کیا ہوں
پھر وہی فکر کہ کب تک غمِ رسوائی ہے
دلِ پرخوں بھی وہی ہے وہی احرام وفا
پھر وہی کنجِ قفس پھر وہی تنہائی ہے

قمر صاحب کو شعرگوئی کا چسکا لڑکپن ہی میں لگ چکا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں غزل کہنے لگے تھے۔ بعد میں نظموں کی طرف مائل ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی مبارک شمیم سے اصلاح لیتے تھے۔ ابتدائی کلام 'شعاع' دہلی، مجالستان دہلی، جھلک علی گڑھ میں شائع ہوا۔ بعد میں شاہراہ دلی شاعر ممبئی پگڈنڈی اور بعد اور شیرازہ کراچی میں غزلیں اور نظمیں تواتر سے شائع ہوئیں۔ ان کی شاعری کا پہلا دور 1952 سے 1962 کے عرصے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران وہ تاشقند یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے۔ 1962 سے 1982 تک ان کی شاعری کا دوسرا دور کہا جائے گا۔ جب وہ نئے آفاق والناس سے روشناس ہوئے۔ اسی دوران انھوں نے ازبکی زبان کے کلاسیکی شعرا کا مطالعہ کیا اور اپنے معاصرین کی شعری کاوشوں کو ازبیک اور تاجکی زبانوں سے اردو میں منتقل کرتے رہے۔ ان کے شعری سفر کا تیسرا دور 1982 سے شروع ہوکر ان کی زندگی تک جاری رہا۔ اس دوران بھی وہ بطور ڈائرکٹر انڈین کلچرل سینٹر تاشقند سے وابستہ رہے اور وہاں کی ہوشربا فضاؤں میں شعرونغمہ کی تانیں گونجتی رہیں۔

کھلی جو زلفِ سیاہ اس کی
کھلے جو شانے
کھلیں جو باہیں
تو شبستان شب کے پہلو سے
آگ کے آبشار پھوٹے
کھلے جو بندِ قبا
تو زرتشت کے حرم میں اسیر
آتشِ کدے بھی چھوٹے
شعاعیں اس کے بدن سے چھن کر
جو آرہی تھیں
دہکتے شانوں پہ میکدہ ساتھ لا رہی تھیں
تپش لہو میں رواں دواں تھی
تو حشر سانسیں اٹھا رہی تھیں

یہ نظم علی گڑھ کی دین ہے یا لکھنؤ کی یا پھر تاشقند کی اس بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ہمیں بدر باغ کے مختصر کمرے کا بار بار خیال آتا ہے۔ جسے ہم نے ہمیشہ نغمہ بار دیکھا۔ جہاں ایک عجب سی خوشبو مہکتی رہتی تھی جیسے کوئی اپنی زلفوں میں کھلے ہوئے گلاب چھوڑ گیا ہو۔

علی گڑھ میں قمر صاحب کا کمرہ دن بھر لوگوں کی آوا جائی سے آباد رہتا۔ احمد جمال پاشا انور صدیقی حسن مثنیٰ احسن اشرف عثمان غنی امیر شرر، بلدیو مرزا، شاہد مہدی، رضوان یہاں کا پھیرا ضرور لگاتے تھے۔ حامد اللہ آبادی سے بھی یہیں ملاقات ہوئی تھی جو آواز لگا کر روسی ادب فروخت کرتے تھے۔ شاعری سے گہرا شغف تھا۔ ان کی مختصر سی شعری کتاب شعلۂ شائع ہوچکی تھی قمر رئیس ان کی بیحد قدر کرتے تھے۔ فوق کریمی بھی ان کے ملنے والوں میں شامل تھے۔ جنھیں ریختی کہنے میں کمال حاصل تھا۔ باغ و بہار شخصیت والے احمد جمال پاشا بھی ہمیں یہیں ملے تھے۔ رسمیات اور تکلفات سے کوسوں دور تھے، گورے چٹے، سرخ وسپید، کالی شیروانی میں ان کی پھبن بس دیکھتے ہی بنتی تھی۔ ہنسا ہنسانا ان کی سرشت میں شامل تھا۔ قمر رئیس کو بڑی بے تکلفی کے ساتھ اماں قمر اماں قمر کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور قمر صاحب خوب خوش ہوتے تھے۔ انہی دنوں ان کی مرتب کردہ کتاب مجاز کے لطیفے جھلک رسالے کے اڈیٹر طاہر قریشی نے شائع کی تھی۔ اردو میں ایم اے کر رہے تھے۔ اور ادب میں 'مارشل لا' لکھ کر مزاح نگاروں کی اگلی صف میں شامل ہوچکے تھے۔

بلدیو مرزا انگریزی کے آدمی ہیں۔ موسیقی سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ انگریزی میں اسکائی لارک (Sky Lark) میگزین نکالتے ہیں۔ جن دنوں قمر صاحب پریم چند کے ناولوں پر کام کر رہے تھے۔ بلدیو تقریباً روز ہی ان سے ملتے تھے۔ قمر رئیس ان سے بڑی محبت کرتے تھے جہاں اور جب موقع ملتا بلدیو کو آگے بڑھا کر خوش ہوتے۔

بلدیو مرزا موٹا سردار تھے۔ قمر صاحب کو ''کمر صاحب'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ پنجابی لہجہ کی کرشمہ سازی کہ قمر رئیس کے بھرے پُرے وجود کو

انھوں نے محض ''کمر'' تک محدود کر دیا تھا۔ ان کے طوفانی عشق کی حکایت قمر صاحب کے خاکے کی صورت میں رقم کی جس کا ایک ایک لفظ ہمارے دل پر نقش ہے۔ بلاشبہ ان صاحب طرز نثر نگار تھے۔ وہ رشید صاحب کی طرح شگفتہ مزاج تھے اور بڑی بات یہ تھی کہ مشکل سے مشکل خیال کو بھی ہنرمندی کے ساتھ پیش کرنے کے فن سے کماحقہ آشنا تھے۔ اگر وہ محض خاکہ نگاری پر پوری توجہ دیتے تو ان کا شمار ممتاز خاکہ نگاروں میں ہوتا۔

تنقیدی مضامین پر مشتمل ان کی پہلی کتاب تلاش و توازن غالباً 1967 میں شائع ہوئی تھی اور از راہِ کرم ایک نسخہ ہمیں بھی مرحمت فرمایا تھا۔ بر بنائے تجسس ہم نے کتاب کا ایک ایک لفظ نہ صرف پڑھا بلکہ اپنی روح میں بھی اتارا۔ ترقی پسند نقطۂ نظر کو جس شفافیت اور معروضیت کے ساتھ فکشن کی تنقید میں برتا تھا۔ اس کے لیے وہ ہر طرح داد کے مستحق تھے۔ ناول کی تنقید میں خصوصی طور پر اور افسانے کی تنقید میں عمومی طور پر انھوں نے ترقی پسند جمالیات کی ایک نئی فضا کو جنم دیا۔ ہیگل کی روحانی جمالیات اور مارکس اور اینگلز کی جدلیاتی مادیت کو انھوں نے وسیع تناظر میں قبول ضرور کیا مگر پروپیگنڈہ کی جماعتی ادب کی بیخ کنی کرنے میں ذرا بھی پس و پیش سے کام نہیں لیا۔

اپنے طالب علموں، دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ محبت آمیز سلوک قمر صاحب کے مزاج کا حصہ تھا۔ ذہانت اور ذکاوت کے ساتھ ساتھ سخاوت بھی ان کی شخصیت کی آبرومندی کو بڑھاتی تھی۔ خواجہ احمد فاروقی کہہ کر رشید حسن خان کو دلی یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیق میں لانے والے قمر رئیس تھے۔ حالانکہ وہ ڈگری یافتہ نہیں تھے۔ صدر شعبہ خواجہ احمد فاروقی نے انھیں تحقیقی معاون کی جگہ دے دی۔

قمر صاحب کی کشادہ دلی کا یہ عالم تھا کہ ان پر تنقید کی جائے تو وہ ناراضگی کے بجائے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان کی کتاب ''ترقی پسند ادب کے معمار'' شائع ہوئی تو میں نے فون کرکے اس پر اعتراضات کی بوچھار کر دی۔ وہ نہایت صبر و سکون کے ساتھ حیرت اعتراضات سنتے رہے جب میں اپنی بات پوری کر سکا تو رسان بولے۔ ''ابھی تم غصے میں ہو، دلی آؤ گے تو آرام سے بات ہوگی اور تمھیں کتاب بھی پیش کریں گے۔''

میں نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا، خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی۔ وہ ہر اعتبار سے بڑے ظرف کے آدمی تھے۔ انھوں نے مہکتی ہوئی بھرپور زندگی گزاری۔ بزمِ طرب ان سے آباد تھی، بادشانہ کی سرمستیوں کے حال احوال سے گریز کرتا ہوں کہ رازہائے درونِ میخانہ پر خامشی کی ردا پڑی رہے۔ ان کی کمزوریاں بھی تھیں، مگر ایسی جن سے محض انھیں نقصان پہنچا، دوسروں کو نہیں۔ ان کے پرانے دوستوں میں قاضی عبدالستار شاہد مہدی، رتن سنگھ، اقبال مجید، امین اشرف عاشور کاظمی اور پروفیسر رضوان کے لیے ان کا چلا جانا ایک ایسا سانحۂ عظیم ہے جس کی بھرپائی ممکن نہیں۔

□□□

پتہ:
328, Eldeco,
Greens Dream Villa,
Gomti Nagar,
Lucknow-226010

انقلاب 1857

مرتب: پی. سی. جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دوررس اثرات مرتسم ہوئے۔ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے یہ پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات پر، اس کے اثرات کا ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں نے بھی جائزہ لیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات: 386، قیمت-/215 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

سید امتیاز الدین

کملا ثریا(1934-2009)

کملا ثریا کا انتقال، ایک آزاد خیال اور بے باک ادیبہ کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ہے جس نے اپنی تحریروں سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جو شخصیت جتنی زیادہ مقبول ہوتی ہے اس کے اتنے ہی زیادہ نام ہوتے ہیں۔ ان کا اصل نام کملا داس تھا لیکن کملا ثریا اور مادھوی کٹی کے ناموں سے بھی جانی جاتی تھیں۔ وہ کیرالا کی سرزمین سے اٹھنے والی پہلی انگریزی شاعرہ تھیں جو نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی مشہور ہوئیں۔ کملا داس کا نام نوبل پرائز کے لیے بھی تجویز کیا گیا تھا۔ ملیالم کی مقبول ترین ادیبہ ہونے کے باوجود کملا نہایت انکسار سے کہتی تھیں کہ ان کا ذخیرۂ الفاظ بہت تھوڑا ہے اور اسی کے سہارے وہ اپنی بات اپنے پڑھنے والوں تک پہنچاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کملا داس کی تحریروں میں الفاظ نگینے کی طرح جڑے ہوئے لگتے تھے اور ان کے پڑھنے والے ان کے طرز تحریر پر فدا تھے۔

کملا داس کا پورا خاندان ملیالی ادب میں خاص مقام رکھتا تھا۔ ان کے ماموں نلپت نارائن مینن اور ماں بالمنی اماں بھی ملیالی کی قلمکار تھیں عورتوں کے مسائل اور جنسی موضوعات پر بھی وہ بہت بے باکی سے لکھتی تھیں۔ ”کلکتے کا موسم گرما“، ”قدیم بازی گاہ“، ”انا ملائی اور دیگر نظمیں“، ”روح کے نغمے“ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ کملا داس کو اپنی خودنوشت سوانح عمری سے بھی بہت شہرت ملی۔ کملا نے صرف تین ناول لکھے بلکہ تیسرے ناول کو انھوں نے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی کہانیاں قصہ گوئی کے فن میں ان کی مہارت کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی ایک کتاب آسٹریلیا سے بھی شائع ہوئی ہے۔ یورپ میں فرنچ، جرمن اور سویڈش زبانوں میں ان کی تخلیقات کے ترجمے ہوئے ہیں۔ 1985 میں انھیں ایشین ورلڈ پرائز فار لٹریچر سے نوازا گیا۔ وہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ بھی تھیں۔ عمر کے آخری حصے میں انھوں نے اپنی زمین ساہتیہ اکادمی کو دے دی تھی۔ کملا داس نے کئی ملکوں کی سیاحت کی تھی۔ کئی ہندوستانی زبانوں میں کملا داس کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ حیدرآباد کے علی اصغر نے کملا داس کی سو منتخب نظموں کا ”روح کے نغمے“ کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس مضمون میں علی اصغر کے ترجمے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کملا داس کی شاعری میں نارسائی اور ناآسودگی کی کیفیت ملتی ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی جنسی خواہش کا اظہار ان کی اسی محرومی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کملا داس کی عمر کا ابتدائی حصہ کلکتہ میں گزرا جہاں ان کے والد ایک کمپنی میں بڑے افسر تھے۔ کم عمری میں ان کی شادی ایک سن رسیدہ شخص سے کردی گئی۔ وہ کم عمری ہی میں ماں بن گئی تھیں۔ کملا نے اپنے باپ کو اس کی سخت گیری کے سبب کبھی معاف نہیں کیا۔ اپنی نظم ”اندرا گاندھی کے بعد“ میں وہ لکھتی ہیں کہ اندرا گاندھی کے بعد وہ اپنے والد سے سب سے زیادہ خوف کھاتی تھیں۔ اپنے باپ کو مخاطب کر کے کہتی ہیں:

آپ منتخب کرتے تھے میرے کپڑے
میرے ٹیوٹر، میرے تفریحی مشاغل، میرے دوست
اور پندرہ برس کی عمر میں آپ نے چن دیا
ایک شوہر میرے لیے، میری ساڑی کے ساتھ
ایک آدمی اور ایک بے لطف زندگی نواحِ شہر کی
کروشیا، کشیدہ کاری اور جمعرات کی پکوان کی کلاس سے
درخشاں کی ہوئی
میں ممنون ہوں
لیکن یہ میرے لیے مناسب ترین ریکھا نہیں تھی
یہ میری پسند کا کام نہیں تھا
میں جانتی ہوں پتا جی میں نے آپ کو مایوس کیا
لیکن آپ نے بھی مجھے کافی سزا دی ہے نا!
آج ہم نے ایک دوسرے کا حساب چکتا کردیا ہے
آپ اس جہان سے رخصت ہو چکے ہیں
اب آپ سے کوئی نہیں ڈرتا
اور میں آخر کار خوف سے نجات پا کر
کوئی راحت محسوس نہیں کرتی
میں خود کو مری ہوئی محسوس کرتی ہوں
جی ہاں آپ سے بھی بڑھ کر!

کملا ثریا کی انگریزی شاعری کے بارے میں ناقدوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنے محسوسات کو من وعن رقم کردیتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک ہنگامی کیفیت ملتی ہے جیسے ایک واقعہ ہوا اور گزر گیا۔ اصل میں کملا ایک بے چین روح تھی جو زندگی بھر سکون کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ اس نے صرف شاعری اور افسانہ نگاری ہی کو اختیار نہیں کیا بلکہ مصوری بھی کی۔ 1984 کے پارلیمانی انتخابات میں وہ بحیثیت امیدوار کھڑی ہوئیں اور ہار گئیں۔ شاید سکون کی یہی

تلاش تھی کہ دسمبر 1999 میں کملا مسلمان ہو گئیں اور اپنا نام کملا ثریا رکھ لیا۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کملا نے کہا تھا کہ اگر مجھے دنیا میں پھر بھیجا جائے تو میں ایک پنچھی بن کر پیدا ہونا پسند کروں گی تاکہ میں ہواؤں میں اڑتی پھروں اور سریلے نغمے سناؤں۔

کملا ثریا کے جانے کے بعد ان کے لاکھوں چاہنے والوں کو شاید انھی کی ایک کہانی یاد آئے۔ اس کہانی کا خاتمہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک شخص جب شام میں اپنے گھر پہنچتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی مردہ پڑی ہوئی ہے بیوی کی آخری رسومات کے بعد اسے خیال آتا ہے کہ اسے اپنے معصوم بچوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا ہے۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مرنے سے پہلے اس کی بیوی نے کھانا تیار کر دیا تھا۔ شوہر اور بچے نہایت تڑپ کے ساتھ وہ کھانا کھاتے ہیں۔ بچوں کو یہ تکلیف دہ احساس رہتا ہے کہ وہ اپنی ماں کا پکایا ہوا آخری کھانا کھا رہے ہیں۔ کملا نے ادب کے دسترخوان پر اپنی نگارشات چن دی ہیں تاکہ ان کے چاہنے والے ان کی یاد کا کرب ان کی تحریروں کے ذریعے کم کرنے کی کوشش کریں۔

کملا ثریا زندگی کی ناپائیداری سے بہت خائف تھیں ان کی شاعری میں موت کی آہٹ صاف سنائی دیتی ہے ان کی ایک نظم ''الفاظ پرندے ہیں'' پر میں اپنے مضمون کو ختم کرنا چاہوں گا۔

الفاظ پرندے ہیں
مضمحل پنکھ لیے
وہ کہاں چلے گئے ہیں رین بسیرے کے لیے
کیا شام کے دھندلکے سے چھپ رہے ہیں
شام کا دھندلکا ہے میرے گیسوؤں پر
شام کا دھندلکا ہے میرے بدن پر
سونے کے لیے جب میں اپنے بستر پر لیٹتی ہوں
تو مجھے یقین نہیں آتا
کہ میں پھر ایک بار
طلوعِ صبح کا
پُرکیف منظر دیکھ سکوں گی

□□□

پتہ:
3-5-805, Hyderguda, Hyderabad-500029

فانی بدایونی (جدید ایڈیشن)

مصنف: مغنی تبسم

اردو غزل کے احیائے جدید میں فانی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے اس کتاب میں فانی کی حیات، شخصیت اور شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ موصوف نے فانی کے ناقدین و محققین، عزیز و اقارب، احباب اور جاننے والوں سے شخصی ربط پیدا کر کے ان سے متعلق اہم معلومات یکجا کر دیا ہے اور شاعر کے فن کے تجزیے کے لیے لسانیات کی اہم شاخ ''اسلوبیات'' کے ذریعے کلامِ فانی کے صوتی آہنگ کا دلچسپ مطالعہ کیا ہے جو اردو شعر و ادب میں اپنی نوعیت کی باضابطہ کوشش ہے۔

صفحات: 499، قیمت -/210 روپے

شکست پندار

مصنفہ: جین آسٹن، مترجم: عبدالعلیم قدوائی

انگریزی کی مشہور زمانہ ناول نگار کے ناول ''پرائیڈ اینڈ پریجوڈیس'' کا ترجمہ عبدالعلیم قدوائی نے کرداروں کی مناسبت کے لحاظ سے ''شکستِ پندار'' کیا ہے۔ یہ ناول پہلی بار 1813 میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس وقت کے انگلستان کے متمول اور متوسط طبقے کے سماجی رجحانات، معاشرتی الجھنیں، اخلاقی عیوب، روزمرہ کے حالات اور دیہی علاقوں کے دلکش قدرتی مناظر کی مصوری حقیقت پسندی کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس کا مطالعہ اس اعتبار سے بھی دلچسپ ہے کہ اس کے بہت سے معاملات اور حالات ہمارے ملک سے مماثل ہیں۔

صفحات: 341، قیمت -/216 روپے

آبگینۂ نظر

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

گلوب کے اطراف میں بسنے والے ایک ارب 50 کروڑ مسلمانوں کی طرف دوستی، امن، صلح کا ہاتھ بڑھانے والا اور مسلمانوں کے ہی انداز میں 'السلام علیکم' کہہ کر پوری مسلم دنیا کو مخاطب کرنے والا شخص کوئی اور نہیں امریکی صدر براک حسین اوبامہ ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف مسلم دنیا، مسلم علما اور سیاست دانوں کو بلکہ پوری دنیا کو حیرت واستعجاب میں ڈال دیا۔

ایک جابر حکمراں کے بعد براک حسین اوبامہ نے سپر پاور امریکہ اور مسلم دنیا کے درمیان تعلقات کی ایک نئے انداز سے ابتدا کرنے کی ضرورت کے مدنظر 4 جون، 2009، جمعرات کو مصر کے تاریخی شہر قاہرہ میں عالم اسلام سے خطاب کرتے ہوئے باہمی اتفاق اور امن کو قائم کرنے، گزرے ہوئے دنوں کی بے یقینی اور ناامیدی کو ختم کرکے رشتوں کے نئے باب کھولنے کی اپیل کی ہے۔

امریکی صدر نے کہا کہ ان کے اس دورے کا مقصد امریکہ اور اسلامی دنیا میں بے اعتمادی اور اختلافات ختم کرنا ہے جبکہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ امریکہ اپنی کچھ غلط پالیسیوں کی وجہ سے عالم اسلام سے دور ہوتا چلا جارہا ہے اور ملکی وقار روز بروز کم ہورہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ وقت اور موقع کے منتظر تھے کہ کب اس فاصلے کو کم کرنے کے لیے قدم اٹھائیں اور 4 جون کو انھیں اپنے خیالات، احساسات ظاہر کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ بغیر کسی تیاری کے مصر کی قاہرہ یونیورسٹی میں عالم اسلام سے مخاطب ہوئے، مگر یہ تو امریکہ کے صدر کی تقریر تھی، دنیا کا کوئی بھی سربراہ بغیر مشورے اور ملکی پالیسی کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتا۔

اوبامہ یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مسلم دنیا ان کے ملک کو ان کے سابق صدر کی کچھ غلط پالیسیوں کی وجہ سے پسند نہیں کرتی اور ماضی کی تلخیوں کو بھلانے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے لیکن اگر کسی تعمیری کام کی ابتدا صدق دلی اور دیانت داری سے کی جائے تو کامیابی بھی ضرور ملتی ہے۔ توڑنے میں وقت نہیں لگتا لیکن جوڑنے میں وقت چاہیے اور صرف یہی نہیں ابتدا بھی اسی کو کرنی پڑتی ہے جو اپنی غلطی محسوس کرتے ہوئے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے گرم جوشی کا مظاہرہ کرے۔ اور یہی جذبہ تھا جس نے براک حسین اوبامہ کو یہ کہنے کے لیے مجبور کردیا کہ "ہمیں ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر خوش گوار تعلقات کے نئے عہد کا آغاز کرنا چاہیے۔" اعتماد بحال کرنے کی اہمیت اور ضرورت کو وہ بخوبی سمجھ رہے ہیں، مسلمانوں کا اعتماد حاصل کیے بغیر اسلامی دنیا سے تعلقات پروان نہیں چڑھ سکتے۔

اس تقریر کا ایک اہم نکتہ یہ بھی تھا کہ صدر نے یہ تسلیم کیا کہ فلسطین کے عوام کے ساتھ انصاف نہیں ہوا اور غیر ملکی قبضے کی وجہ سے ہی مظلوم فلسطینیوں کی یہ حالت ہوئی ہے۔ صدر کی بات یہیں ختم نہیں ہوتی، انھوں نے اسرائیل سے یہودی آبادکاری کو فوری روکنے اور ایک فلسطینی ریاست کے حق کو تسلیم کرنے پر بھی زور دیا۔ ان کا یہ کہنا بڑا معنی رکھتا ہے کہ اسرائیل نے غزہ میں غیر انسانی حالات پیدا کیے ہیں ان جملوں کا واضح اشارہ یہ ہے کہ اسرائیل ظالم ہے اور فلسطین مظلوم، اب کون انکار کرسکتا ہے کہ امریکہ جو اسرائیل کا سب سے بڑا حمایتی ہے اس کا صدر اسے اس تشدد کا ذمہ دار قرار دے رہا ہے جو فلسطین کے عوام کے ساتھ برسوں سے ہورہا ہے۔

اس موقعے پر صدر نے کئی اور اہم باتیں کہیں مثلاً یہ کہ امریکہ اسلام کا قطعی مخالف نہیں۔ اور اس کی جنگ تشدد کے خلاف ہے اسلام کے خلاف نہیں۔ امریکہ چاہتا ہے کہ تشدد پوری دنیا سے ختم کردیا جائے اور اسلام بھی تشدد کے راستے کو اختیار کرنے سے منع فرماتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم فرقے نے امریکہ کی ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ بحیثیت صدر میرا یہ بھی فرض ہے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں انھیں دور کروں۔ ہوسکتا ہے کہ امریکی صدر کا یہ پیغام امن، شدت پسندوں تک رسائی حاصل کرلے اور اس کے مثبت اثرات مرتب ہوں کیونکہ شدت پسندی کے پیچھے کہیں نہ کہیں، ناجائز دباؤ، ظلم وجبر اور ناانصافیاں موجود ہیں۔ اگر اس طرح کی پہل پہلے کی گئی ہوتی تو امریکہ کا ملکی اور فوجی وسائل کا اتنا بڑا حصہ جنگ لڑنے میں خرچ نہ ہوتا۔ غرور کے نشے میں چور حکمراں نے امریکی عوام کو بالکل نظرانداز کردیا تھا۔ بین الاقوامی رشتوں میں مفاہمت کے بجائے تکبر اور ناانصافی نے معاملات کی پیچیدگیوں کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ عام امریکی گھبرا کر ایسی حکومت اور حکمرانی سے پناہ مانگنے لگے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ براک حسین اوبامہ امریکہ کے نئے صدر منتخب ہوئے۔ آج عام امریکی شہری سے لے کر پوری دنیا، اوبامہ کی جانب امید کی نگاہ سے دیکھ رہی ہے اور اوبامہ بھی ان کی امیدوں کا بھرم رکھنے کی کوشش میں سرگرم ہیں۔

اسی تقریر میں اوبامہ نے یہ صفائی بھی دی کہ امریکہ عراق میں رہنے کا بالکل خواہشمند نہیں، 2012 تک تمام امریکی فوجی عراق خالی کردیں گے اور جولائی تک امریکی فوج مکمل طور پر شہر کو خالی کردے گی۔

امریکی صدر براک حسین اوبامہ نے ایک اور جرأت دکھاتے ہوئے دو ٹوک انداز میں کہا کہ امریکہ سے جو غلطیاں ہوئی ہیں وہ انھیں سدھارنا چاہتے ہیں۔ یہ جملے کسی معمولی شخصیت کی زبان سے ادا نہیں ہو رہے، بلکہ دنیا کے انتہائی طاقتور ملک کا سربراہ کہہ رہا ہے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے قرآن مجید کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے اس کی تشریح اس طرح کی" کہ قرآن میں آیا ہے کہ جس نے ایک معصوم انسان کا قتل کیا اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا۔" یہ قابل قدر بات ہے کہ امریکی صدر یہ کہہ رہا ہے کہ اسلام نے دنیا کو امن کا راستہ دکھایا ہے۔ نیز قرآن اور انجیل دونوں امن کا پیغام دیتے رہے ہیں۔

ایران کے ساتھ تعلقات میں بغیر کسی شرط کے غیر مشروط طور پر امریکہ بات چیت کے لیے تیار ہے، جبکہ سابقہ صدر کی پالیسیوں نے نیوکلیائی تجربوں کے نام پر ایران پر ہمیشہ اپنے فیصلوں کو تھوپنے کی کوشش کی ہے۔ اوبامہ نے ایران کے ساتھ بات چیت کی پیش رفت ظاہر کر کے، اس کے بیرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے سے خود کو باز رکھا ہے۔

امریکی صدر کے مطابق اکیسویں صدی میں ترقی کی بنیاد تعلیم اور حقوق پر ہوگی اور مسلم طلبہ کو امریکہ میں تعلیمی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

اوبامہ نے عورتوں کے حقوق کی پامالی اور دوسرے مذاہب اور دیگر افراد کی جانب سرد لہری کے بجائے نرم روی اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی کمی جیسی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ ان کا ماننا ہے کہ کوئی ایک مذہب ہی ان کمزوریوں کا ذمے دار نہیں اور یہ اسلام مذہب کی کمزوریاں نہیں بلکہ یہ مسلم معاشرے کی کمزوریاں ہیں اس سے انھوں نے مسلم رہنماؤں، دانشوروں، سیاست دانوں سب کو ایک نئی سوچ کا نقطہ بھی فراہم کیا، کیونکہ خود کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے سے پہلے راہ کے پتھروں کو چننا ضروری ہے۔

امریکی صدر براک حسین اوبامہ نے تاریخ میں ہوئی امریکی کوتاہیوں کی تلافی کی تو دوسری جانب مستقبل کے لیے نئے خواب بھی دیے ہیں امریکہ کی عالم اسلام کے تئیں غلط پالیسیوں کو ختم کرنے کی جانب ان کی یہ تقریر پہلا قدم ہے اور جب بھی کسی نے کوئی نئی شروعات کرنے کی کوشش کی ہے سماج نے فوراً ہی قبول نہیں کر لیا ہے۔ کچھ لوگ نئی پیش رفت پر سوال اٹھا رہے ہیں، بے اعتباری بے وجہ نہیں ہے لیکن جب تک ماضی کو فراموش نہیں کیا جائے گا تب تک ترقی ناممکن ہے۔

حالات اور وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ عالم اسلام صدر اوبامہ کی اس امن پیش کش کو دانشوری سے دیکھتے ہوئے آگے آنے والی نسلوں کے مفاد کے مدنظر فیصلے کرے۔

اوبامہ کی تقریر کے کچھ اہم نکتے جن سے کئی مسلم ممالک کا نہ صرف آج بلکہ مستقبل بھی جڑا ہوا ہے۔ ان نکات کے پیش نظر ایک ایسا لائحہ عمل تیار ہو، جہاں ہر ایک ملک اپنی شناخت کے ساتھ ساتھ تمدن اور تہذیب کو بھی برقرار رکھ پائے، کیونکہ امریکہ اس لیے اگر عالم اسلام سے دوستی اور امن چاہتا ہے تو یقیناً کہیں نہ کہیں یہ بات پوری دنیا کے سامنے واضح ہو جاتی ہے کہ مسلم دنیا کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اس وقت پوری دنیا تشدد کے زیر سایہ ہے۔ پوری انسانیت ہی پامال ہو رہی ہے، تہذیبوں کا تصادم بڑھ رہا ہے۔ ایسے میں اوبامہ اس سیاہ آسمان پر بجلی کی طرح چمکنے والی چاندی کی ایک کرن معلوم ہو رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بجلی کی طرح کڑک کر خاموش ہو جائے؟ اوبامہ کی جانب سے خیر سگالی اور امن کا یہ پہلا قدم، ایک آئندہ خوشحال، تابناک مستقبل کی نشاندہی کر رہا ہے۔ بس اس تصویر میں حقیقت کے رنگ بھرنا باقی ہے۔

□□□

پتہ:
A-7, Khajoori Road, Batla House
Jamia Nagar, Okhla,
New Delhi-110025

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی و سیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت-/33 روپے

شمیم احمد صدیقی

فضائی آلودگی اور اس کا تدارک

ہم بخوبی واقف ہیں کہ جس طرح انسانی زندگی کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان بنیادی ضروریات کے زمرے میں ہیں اسی طرح انسانی صحت کے لیے صاف ستھری ہوا، صاف ستھرا پانی اور سورج کی روشنی بھی ناگزیر ہیں۔ ہمارے پروردگار نے ہوا کو تمام عالم میں پھیلا رکھا ہے۔ پانی کو گلیشیر، سمندر، دریا، جھیلوں اور زیرِ زمیں آبی ذخائر کی شکل میں زمین کے دو تہائی سے زائد حصے پر پھیلا رکھا ہے اور بلاناغہ ایک مقررہ وقفے تک روشنی دینے کے لیے سورج کو ہماری خدمت پر مامور کر رکھا ہے۔ جس ہوا کو ہم سانس لے کر گندہ کر دیتے ہیں اس کو دوبارہ صاف ستھرا کرنے کے لیے پیڑ پودوں کی شکل میں بے شمار قدرتی فیکٹریاں بھی لگا رکھی ہیں اور پانی کو بھاپ کی شکل میں اوپر اٹھا کر اور بارش کی صورت میں صاف شفاف پانی دوبارہ مہیا کرانے کا نظام بھی قائم کر رکھا ہے سورج کی روشنی میں موجود جسم انسانی کو نقصان پہنچانے والی بالا بنفشی شعاعوں کو روکنے کے لیے خلا میں اوزون (ozone) گیس کی دبیز چادر بھی تان رکھی ہے۔ گویا پروردگار نے انسان کو دنیا میں چین سے زندگی بسر کرنے کے لیے تمام چیزیں وافر مقدار میں مہیا کرادی ہیں۔

موجودہ دور کے انسان کی یہ بدنصیبی ہے کہ ایک طرف تو اس نے اپنے پیدا کرنے والے کے اس پیغام کو جس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ ”زمین میں فساد برپا مت کرو جبکہ اس کی اصلاح کی جاچکی ہے۔ بالائے طاق رکھ کر نظام قدرت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تو دوسری طرف اپنے بزرگوں کی اس تعلیم کو بھی یکسر بھلا دیا کہ ”دنیا ضرورت پوری کرنے کی جگہ ہے، خواہشات پوری کرنے کی جگہ نہیں ہے۔“ اس تنبیہ اور ہدایت کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے ہی انسان رفتہ رفتہ ایسی الجھنوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا کہ اب اس کے سکون و چین کو ہی نہیں اس کی صحت بلکہ بقا کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اگر ہم جنگلوں کا مناسب استعمال کرتے بھی تو لکڑی یا درختوں کی کمی نہ محسوس ہوتی۔ اس کمی کے ازالے کے لیے بھی ہم نے کچھ نہیں کیا۔ شہروں اور قصبات میں معدودے چند افراد ملیں گے جنھوں نے اپنی زندگی میں کوئی پودا لگا کر اس کو پروان چڑھایا ہو البتہ ایسے افراد کثیر تعداد میں ملیں گے جن کی خواہشات کی تکمیل کی خاطر ایک سے زاید درختوں کو قربان ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ جب 20-25 سال کے طویل وقفے میں برگ و بار لانے والے درخت یک لخت کاٹ کر استعمال میں لائے جاتے رہیں گے اور ان کی جگہ نئے درخت لگائے نہیں جائیں گے تو اس علاقے سے پیڑوں اور لکڑی کا غائب ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوگی۔ لکڑی مہیا کرانے کے علاوہ درخت انسانوں سمیت تمام حیوانات کو آکسیجن بھی مہیا کراتے ہیں۔ اگر کرۂ ارض پر درختوں کی معتدبہ تعداد نہ ہوگی تو انسانوں اور دیگر حیوانات کے سانس لینے سے خارج ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ پورے طور پر آکسیجن میں تبدیل نہ ہوگی اور ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ آکسیجن کی کمی یا فقدان کی بنا پر تمام حیوانات لقمۂ اجل بن جائیں۔

گزشتہ صدی کے نصف اوّل تک آمدورفت اور باربرداری کے لیے زیادہ تر جانوروں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ موٹر، ٹرک، لاری وغیرہ صرف بڑے شہروں میں دکھائی دیتے تھے اور ان کی زیادہ ریل پیل نہ تھی۔ انسان کی سہولت پسند طبیعت اور عیش پرست مزاج کے پروان چڑھنے سے مشینی سواریوں کی ریل پیل ہو گئی۔ قدرتی گیس سی این جی کی دریافت سے قبل تمام مشینی سواریاں پٹرول یا ڈیزل سے چلتی تھیں اور ان کی خاصی تعداد اب بھی رواں دواں ہے۔ ان گاڑیوں کے انجن ماحول میں کثیف دھواں اور کچھ زہریلی گیس، جیسے کاربن مونو آکسائیڈ، سلفر ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے بے تحاشہ اور بے محابہ استعمال سے ہمارے گردوپیش کا ماحول کثیف ہوتا جاتا ہے اور یہ ماحول نئی نئی بیماریاں پیدا کر رہا ہے۔ مشینی سواریوں کی اس ریل پیل کا ایک نقصان جس کا احساس شہروں میں بسنے والے لوگ نہیں کر پاتے، یہ بھی ہے کہ سواری، باربرداری یا جتائی میں استعمال ہونے والے جانوروں کے فضلات سے تیار ہونے والی قدرتی کھاد سے بھی محروم ہوتے گئے اور اپنے کھیتوں کی پیداواری صلاحیت قائم رکھنے کے لیے کیمیاوی کھاد کے محتاج بنتے چلے گئے۔ زراعت کے ماہرین کہتے ہیں کہ کیمیاوی کھاد سے زمین یا اس میں بوئی گئی فصل کو محض نائٹروجن، فاسفورس اور پوٹاش ہی مہیا ہوتے ہیں جبکہ کسی بھی فصل کی مکمل نشوونما اور بھرپور غذائیت کے لیے لگ بھگ ڈیڑھ درجن معدنی عناصر درکار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ اب ترکاریوں اور پھلوں وغیرہ کے مزے اور خوشبو میں کمی ہو گئی ہے۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کیمیاوی کھاد تیار کرنے والے کارخانے لگانے کے لیے یا آرام و آسائش کی دیگر اشیا کے لیے کارخانے قائم کرنے کے لیے جتنی زمین استعمال میں لائی جائے گی اس پر آئندہ شجرکاری ممکن ہے اور نہ ہی جانوروں کی افزائش، مزید یہ کہ ہر کارخانہ اپنے دھوئیں اور استعمال شدہ گندے پانی کے اخراج کے ذریعے ماحول کی کثافت میں اضافہ کرتا ہے۔

سوتی یا اونی کپڑوں کی جگہ چمکدار مصنوعی کپڑوں، اناج، پھلوں اور

سبزیوں کو کیڑے مکوڑوں یا بیماریوں سے بچانے کے لیے زہریلے کیمیاوی محلول، قدرتی رنگ و روغن کی جگہ چمکدار کیمیاوی رنگ و روغن اور صحت کی حفاظت کے لیے جڑی بوٹیوں والی دواؤں کی جگہ جلد اثر دکھانے والی کیمیاوی ایلو پیتھک دواؤں کا استعمال بھی عام ہے۔ حال کی چند دہائیوں میں ہم ایک انوکھی قسم کی آلودگی سے دوچار ہوئے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ آلودگی آنکھ سے دکھائی بھی نہیں دیتی۔ دورِ جدید کے مختلف الکٹرانک ساز و سامان مثلاً ٹیلی وژن، انٹرنیٹ، موبائل فون وغیرہ مخصوص قسم کی برقی مقناطیسی لہروں کے ذریعے اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ لہریں ہمارے کان، آنکھ، دماغ اور جسم کے رگ پٹھوں پر کیا منفی اثرات مرتب کرتی ہیں وہ رفتہ رفتہ سامنے آرہا ہے۔ کبھی اطلاع ملتی ہے کہ رنگین ٹی وی اور موبائل فون سے خارج ہونے والی رنگ برنگ کی شعاعیں دماغ کے خلیوں اور آنکھوں پر منفی اثر ڈالتی ہیں۔ کبھی خبر ملتی ہے کہ لیپ ٹاپ استعمال کرنے والوں کی قوت مردانگی متاثر ہورہی ہے اور کبھی پتہ چلتا ہے کہ عمارتوں کی چھتوں پر نصب کیے گئے موبائل کمپنیوں کے ٹاوروں کے قریب بسنے والوں میں مختلف قسم امراض کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اب ایک اہم سوال یہ ہے کہ دورِ حاضر کی آرام و آسائش کی چیزوں کا عادی بن جانے اور تن آسانی کی گرفت سے نکلنے کے محال ہو جانے کے بعد انسان کثافت یا آلودگی کے نقصانات سے بچنے کے لیے اور کرۂ ارض پر اپنے وجود کی بقا اور بہتری کے لیے کیا اقدامات کرے۔ اس سلسلے میں ماحولیات کے ماہرین نے جو مشورے دیے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام الناس کو ماحول کو گندہ کرنے والے اسباب اور آلودگی سے پہنچنے والے نقصانات سے باخبر کرایا جائے۔

ماحول کے تحفظ کے لیے ماحولیات کے اسباق کو اسکول اور کالج کے نصابِ تعلیم کا لازمی جز بنایا جائے۔

فاصلہ کم ہو تو اس کو پیدل چل کر طے کیا جائے کیونکہ پیدل چلنا انسانی صحت کے لیے بے حد مفید ہے۔

روزمرّہ کی زندگی میں مصنوعی اور کیمیاوی اشیا کے استعمال کو کم سے کم رکھا جائے اور قدرتی اشیا کا زائد سے زائد استعمال کیا جائے۔

ماحول کو پراگندہ کرنے والی اشیا کو استعمال کے بعد مناسب طریقے سے ٹھکانے لگایا جائے۔ لاپروائی سے ادھر ادھر نہ پھنکا جائے۔ کارخانوں کے فضلات کو مناسب طریقے سے ٹریٹ (Treat) کیے بغیر خارج نہ کیا جائے۔ انسان اور جانوروں کے فضلات سے بھی بایوگیس بنانے کی ترغیب و تشہیر کی جائے۔

آبادیوں کے اندر یا ان کے قریب فیکٹریوں کے قیام کو روکا جائے بلکہ پہلے سے قائم شدہ فیکٹریوں اور کارخانوں کو بھی آبادی سے دور منتقل کیا جائے۔

شجرکاری کو مہم کے طور پر فروغ دیا جائے۔ سرکاری و نیم سرکاری دفاتر نیز تعلیمی اداروں کو اپنی فاضل زمین پر شجرکاری کرنے کے لیے کم قیمت پر پودے مہیا کرائے جائیں۔

لکڑی، پتھر کے کوئلے، پٹرول اور ڈیزل کی جگہ ایل پی جی، سی این جی، بایوگیس، الکحل اور ہائیڈروجن گیس کو بطور ایندھن استعمال کرنے کے فائدے مشتہر کیے جائیں اور اسی طرح سورج کی روشنی سے پیدا ہونے والی برقی توانائی کو فروغ دیا جائے۔

رنگین ٹی وی، موبائل فون اور اس زمرے کے دیگر الکٹرانک ساز و سامان کے استعمال میں اعتدال برتا جائے۔

مذہبی تیوہاروں اور عوامی تقریبات یا شادی بیاہ کے موقعوں پر آتش بازی اور شور و غل پیدا کرنے والے آلات کے استعمال سے گریز کیا جائے۔

آیئے عہد کریں کہ خود اپنے لیے اور اپنی آنے والی نسلوں کی بھلائی کے لیے فضائی آلودگی کی روک تھام کے اصولوں پر ہم سختی سے عمل کریں گے۔

□□□

پتہ:
C, Naseem Manzil, Madeh Ganj Police Chowki,
Sitapur Road, Lucknow-20

اندر سبھا کی روایت

مصنف: پروفیسر محمد شاہد حسین

سنسکرت ڈرامائی روایات کی زائیدہ ''اندر سبھا کی روایت'' ایک ایسی روایت ہے جس نے ہندوستانی ڈرامائی روایات کی توسیع کے ساتھ ایک صدی تک اردو ڈرامے پر اپنے اثرات مرتب کیے، پروفیسر محمد شاہد حسین نے بڑی باریکی سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ تین باب اور کئی ذیلی ابواب کے تحت انھوں نے سنسکرت ڈرامے کی روایات، عوامی روایات جیسے رام لیلا، راس لیلا، بہروپیا، بھنڈیتی، بھگت بازی، نقالی، کٹھ پتلی کا ناچ، داستان گوئی، مرثیہ خوانی، مجرے، درباری ڈرامے اور پارسی اسٹیج کا ادبی و فنی نقطۂ نظر سے تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

صفحات: 343، قیمت-/140 روپے

کاشف غزالی

کیریئر سازی میں بھروسہ مند صلاح کار

جو لوگ اپنے منتخب کیریئر میں کامیاب مانے گئے ہیں دراصل کامیابی ہی ان کی زندگی کا رخ بدل دیتی ہے۔ ذاتی منصوبہ بندی میں مطمحِ نظر کا تعین رسمی عمل ہوتا ہے۔ زندگی میں کوئی مقصد طے کرنے کے بعد ہم اس کو حاصل کرنے کے لیے مرحلہ وار قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہیں ہمارے مستقبل کی تصویر ہمارے ذہن میں بالکل واضح ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا کس طرح اور کب کرنا ہے۔ ہم اس کے لیے شعوری اور سنجیدہ کوشش کرتے ہیں۔ کیریئر سازی طویل المدت منصوبہ سازی ہے جس کو مستعدی، صبر واستقامت اور عزم محکم سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا جاتا ہے۔ لیکن کیریئر کا انتخاب انتہائی نازک، پیچیدہ اور دوررس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے لیے دوراندیشی اور پیش روی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا کیریئر کا خاکہ تیار کرنے کے سلسلے میں تجربہ کار قابل بھروسہ مشیر کی صلاح آپ کے لیے ایک نعمت ثابت ہوسکتی ہے۔ والدین دوست واحباب میں سے بھی کوئی فرد آپ کا مخلص و ہمدرد اصطلاح کار ہوسکتا ہے۔ آج کل صلاح کاری کی اصلاح مثبت معنوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس کا چلن عام ہے۔ بلکہ معاشرہ کی روز افزوں پیچیدگیوں کے پیش نظر دوستانہ صلاحکاری کی وسعت اور افادیت میں اضافہ ہوا ہے صلاح کاری یا مشاورت ایک ایسے رشتے کی بنیاد جس کے ذریعے آپ اپنے پیشہ ورانہ تجربات اور مہارتوں میں دوسروں کو شریک کرسکتے ہیں اس طرح فریقین کے علم وآگاہی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اس طرح کے ذہنی تبادلوں سے صلاح کار اور صلاح جو دونوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ صلاح کار دوسروں کی دانشورانہ کاوشوں کو جلا دے کر شہرت ونیک نامی حاصل کرتا ہے۔ وہ صاحب استعداد لوگوں کی نشاندہی کرکے معاشرہ کے لیے مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ وہ بہت سے نکات صلاح جو کے لاشعور سے شعور میں لاکر اس میں مقصدیت اور لگن پیدا کرتا ہے۔ جو وقت آنے پر اس کے لیے نعمت خداوندی ثابت ہوتی ہے صلاح کار اور صلاح جو باہمی تعلق رسمی بھی ہوستکا ہے اور غیر رسمی بھی۔ مختصر مدت کے لیے یا پھر تاحیات بھی۔ بھروسہ مند مشیر وصلاح کار کی تلاش کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھنا بنیادی ضرورت ہے کہ اس کے ذہنی ساخت، سوچنے سمجھنے کا انداز، سماجی اور ثقافتی اقدار اور تجربات آپ کے مزاج اور سوچ سے کافی مطابقت رکھتے ہوں اور وہ آپ کے ساتھ ذہنی لین دین کے لیے اپنا قیمتی وقت دے سکتا ہو۔ لیکن یاد رکھیے کہ آپ کا صلاح کار صرف آپ کو صلاح دے سکتا ہے اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا صرف اور صرف آپ کی ذمے داری ہوگی۔

روشن خیال اور بالیدہ MENTOR کی خصوصیات اس طرح بیان کی گئی ہیں:

M۔ رشتہ کو مستحکم واستوار بناتا ہے۔

E۔ ہمت افزائی کرتا ہے۔

N۔ ذہنی روابط کی پرورش کرتا ہے۔

T۔ زندگی کے پس منظر وپیش منظر کے خاکہ سے روشناس کرکے زندگی کے نشیب وفراز سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔

O۔ باہمی جذبہ عزت واحترام کو بڑھاتا ہے۔

☆ صلاح جو کی حسب استعداد حاجت روائی کرتا ہے۔

ہمیں بھروسہ مند مشیر کی تلاش کرتے ہوئے حوصلہ مندی اور صبر سے کام لینا ہوگا کسی سے مدد کا طلب گار ہونا آسان نہیں ہے۔ ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے جو زندگی کی آزمائش میں آگے بڑھنے کا حوصلہ اور جستجو دے اور ہم میں کامیابی حاصل کرنے کی لگن پیدا کرے جس سے ہم اپنی منزل مقصود کی جانب بتدریج شادابی اور کامرانی سے آگے بڑھتے جائیں۔

اس مقصد کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ہمیں بامعنی صلاح دے سکتے ہیں۔

کئی تنظیموں میں ایسے شعبے بھی ہیں جو کیریئر کی بہتری کے لیے اپنے ملازمین کو سرگرمی سے عمل پیرا ہونے کی ترغیب دیتے اور ان میں تحریک پیدا کرتے ہیں۔

اگر آپ کے اپنے مینٹر کی طرف سے کوئی بے اعتنائی نظر آئے تو آپ اس سے افسردہ خاطر نہ ہوں۔ آپ پوری طاقت اور دلجوئی سے ان سے بار بار رابطہ قائم کرنے کی کوشش کیجیے۔ لیکن اس بات کا دھیان رہے کہ اپنے مینٹر سے ملاقات رکھنے سے پہلے آپ ذہنی طور پر بالکل تیار ہوں۔ اپنے ذہن میں وہ عام سوالات اتار لیجیے جو آپ فون سے دوران ملاقات پوچھنا چاہیں گے۔ آپ اپنے ضمیر سے یہ بھی پوچھتے رہے کہ آپ مینٹر میں دراصل کس چیز کے متلاشی ہیں اور اس کا اس بارے میں انداز کس قدر معاونانہ ہے۔ اگر آپ اس سے مطمئن نہیں ہے تو کسی اور کی تلاش کیجیے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مینٹر سے ذہنی مفاہمت پیدا ہونے میں وقت لگتا ہے۔ آپ ایک یا دو بار کی ملاقات میں دوسروں کے دل ودماغ گہرائیوں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے ہیں۔ آپ کو صبر وتحمل سے کام لینا ہوگا۔ یہ ایک دوطرفہ عمل ہے جو لینے اور دینے کے فلسفہ پر مبنی ہے۔ ہم میں سیکھنے سکھانے کی صلاحیت اور ٹیم کے طور پر کام کرنے کا جذبہ اور جوکھم اٹھانے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ بک میں ہمارے مینٹر کی صلاح کاری ہماری کیریئر کی ترقی وفروغ میں سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔

□□□

1071, Haveli Anwar Ali,
Bazar Chitli Qabar, Jama Masjid, Delhi-110006

حیدر علی

عبدالصمد سے گفتگو

ہم عصر اردو فکشن میں عبدالصمد کے امتیازات واضح اور روشن ہیں۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے اور کئی ناول شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے جدیدیت کے زمانے میں لکھنے کی ابتدا کی۔ ان کے یہاں جنسی نفسیات، سیاسی شعور اور سماجی سروکار ایسے پہلو ہیں جو ان کے فن کو ایک رنگ عطا کرتے ہیں۔ عبدالصمد کے افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ ناقدین نے اپنے اپنے ڈھنگ سے کیا ہے لیکن ان کے یہاں جو سماجی سیاق ہے اس کو روشن کرنے کی سعی بہت کم کی گئی ہے۔ راقم الحروف نے عبدالصمد سے طویل گفتگو کی جس کا خلاصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

س: ادب اور زندگی کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ اس نہج سے زندگی کو سمجھنے میں افسانہ کیا رول ادا کرسکتا ہے، بالخصوص آپ کے افسانے تفہیم حیات میں کتنی مدد کرتے ہیں؟

ج: افسانہ ہو یا ادب کی کوئی دوسری صنف، وہ انسانی مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے اور زندگی کو سمجھنے میں ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے، لیکن یہ چیز سارے انسانوں پر لاگو نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے ادب سے فطری مناسبت اور تعلیم و شعور کا ہونا ضروری ہے۔ ادب ہمیشہ ایک مخصوص اور چھوٹے طبقے میں مقبول رہا ہے۔ عوامی ادب نام کی چیز یا تو پیدا نہیں ہوئی یا یہ ایک Myth ہے۔

س: آپ کے افسانوں میں جنس اور جنس کی نفسیات موجود ہے۔ ہمارے ہاں منٹو اس حوالے سے ایک اہم نام ہے۔ منٹو اور آپ کے افسانوں میں جو بُعد نمایاں ہے وہ صرف زندگی کے بدلتے رُخ کے باعث ہے یا پھر فنکار کی اپنی شمولیت بھی ایک وجہ ہے۔

ج: جنس ہماری زندگی کا اہم ترین حصہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس کے ساتھ جو ''گندگی'' کا تصور جڑ گیا ہے وہ ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی مہلت نہیں دیتا۔ ضروری نہیں کہ افسانہ نگار کی عملی شمولیت بھی اس کے لکھنے میں شامل ہو۔ بہرکیف جنس یا جنسیات کو اس کے صحیح تناظر میں سوچا جانا چاہیے۔

س: ہمارے یہاں ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' جیسے نظریات موجود ہیں۔ بطور فکشن نگار آپ کس کو اہمیت دیتے ہیں:

ج: میں دونوں کو اہمیت دیتا ہوں لیکن ادب برائے زندگی کی اہمیت مقدم ہے۔

س: آپ نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی۔ اس صارفی سماج میں ناول لکھنا کیا جوکھم مول لینا نہیں ہے؟ ''مباحثہ'' کے حالیہ شمارے میں ناول کی موت کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ اس خیال سے متفق ہیں تو یہ بتایئے کہ ناول کے قاری کون ہیں۔ اگر یہ کوئی مخصوص طبقہ ہے تو کیا اس کے ذریعے سماج میں کوئی اہم تبدیلی نمایاں ہوسکتی ہے؟ کیا ادب سماج کو بدلنے میں معاون ہے؟

ج: میں نہیں مانتا کہ ناول یا ادب کی کسی صنف کی موت ہوگئی ہے۔ ''وقتی پڑاؤ'' کو موت کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ یہ اعلانات پہلے بھی ہوتے رہے ہیں اور غلط ثابت ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ناول لکھنا خاص طور پر اردو میں جوکھم مول لینے کے برابر ہے۔ نہ صرف لکھنا بلکہ اسے چھاپنا بھی۔ جہاں تک اس کے ذریعے سماجی تبدیلی کا سوال ہے تو اس کا جواب آپ کے پہلے سوال میں دیا جاچکا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے کہ دنیا کے سارے ادب میں ناول سب سے مستحکم اور معتزز صنف ادب ہے اور اسے ہمیشہ سر آنکھوں پر جگہ دی جاتی ہے۔

س: ادب اور سماج کے رشتے کو کم و بیش تمام مفکرین نے قبول کیا ہے۔ آپ بطور افسانہ نگار کیا صرف سماج سے مواد حاصل کرتے ہیں؟ واضح ہو کہ سماج ایک given reality ہے جبکہ فن interpreted reality ہے۔ کسی فن پارے کے ذریعے سماج کو کس طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

ج: افسانہ نگار فرد اور سماج کے رشتے کی مضبوطی، گہرائی، گیرائی اور دیرپائی پر اپنی وہ نگاہ نہیں رکھتا جو اس کی مخصوص تیسری آنکھ کا خاصہ ہونا چاہیے۔ given reality اور interpreted reality دونوں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو، دونوں میں اتنا زیادہ بُعد نہیں ہے، جتنا کہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل Perception کا معاملہ ہے۔

س: ترقی پسندوں نے ''ادب برائے سماج'' پر اصرار کیا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے نعرے بھی لگائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب پروپیگنڈا بنتا ہوا محسوس ہوا۔ انھیں کے درمیان منٹو بھی افسانہ لکھ رہے تھے، جن کے یہاں ایک مخصوص سماج اور اس کے تئیں ہمدردی ہے۔ آپ اپنے کو ترقی پسندوں سے جوڑتے ہیں یا اس سلسلے میں آپ کا کوئی دوسرا موقف ہے؟

ج: ادب، فرد اور سماج ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ انھیں الگ الگ خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس زمانے میں صرف منٹو ہی

نہیں، کرشن چندر، بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، غلام عباس، اپندر ناتھ اشک اور ان جیسے دوسرے بہت سے فنکاروں نے بہترین افسانے لکھے جو ہمارے ادب عالیہ میں شمار کیے جاسکتے ہیں اور کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو کسی سے نہیں جوڑتا ہوں۔ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں وہ لکھتا ہوں۔

س: کسی فن پارے، ساجیاتی مطالعہ کرتے ہوئے کیا یہ ضروری ہے کہ فنکار کی زندگی کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ چونکہ فنکار کہیں نہ کہیں اپنے فن میں شریک ہوتا ہے۔ آپ کے جو افسانے ہیں ان میں کیا صرف آپ کا ''سماجی شعور'' ہے یا آپ کی زندگی کا نجی تجربہ بھی؟

ج: کوئی ضروری نہیں۔ فنکار بھی سماج ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے اس لیے وہ لازمی طور پر اپنے فن میں شریک ہوتا ہے۔ تجربہ اور سماجی شعور دونوں افسانہ لکھنے کے لیے لازم ہیں۔

س: آپ کے خیال میں جینیوئن ادب کیا ہے؟

ج: جس میں بے ساختگی سے آپ کی اور آپ کے سماج کی تصویر نظر آئے۔

س: موجودہ عہد میں ادب ہماری کس ضرورت کو پورا کرتا ہے؟

ج: جمالیاتی حس کو، جس کی آج سے پہلے کسی عہد میں اتنی اہمیت نہیں تھی۔

س: آپ سیاسیات کے استاد ہیں اور ایک اہم فکشن نگار بھی۔ آپ یہ بتائیے کہ بطور ایک فن کار اس علم سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ج: میں سیاسیات کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اور میں نے اس علم سے اپنے لکھنے پڑھنے میں بہت استفادہ کیا ہے۔

س: آپ اپنے فن پاروں کو پیش کرتے ہوئے حقیقت نگاری کا کس طور پر خیال رکھتے ہیں، کیا حقیقت نگاری بالکل حقیقت کی طرح ممکن ہے؟

ج: صحافت اور ادب میں یہی فرق ہے کہ صحافت میں سماج پر سیدھی نگاہ ڈالی جاتی ہے جبکہ ادب اس کو اپنی مخصوص نگاہ سے دیکھتا ہے، پرکھتا ہے اور تولتا ہے۔

س: فکشن تنقید کی جو صورت حال ہے، آپ اس میں کسی تبدیلی کے خواہاں ہیں؟

ج: فکشن کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ تنقید نگر اس کا باریکی اور باقاعدگی سے مطالعہ نہیں کرتے اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ اگر تنقید نگار فکشن کا ویسا مطالعہ کریں جو اس کا حق ہے تو یقیناً فکشن کی تنقید کی موجودہ صورت حال میں تبدیلی آئے گی۔

س: کوئی ایسی بات یا تجربہ بتایئے جس کی روشنی میں آپ کے تخلیقی عمل کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔

ج: میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ناول ہو یا افسانہ میری تحریروں کو سیدھا سادہ بیانیہ نہ سمجھا جائے بلکہ بین السطور جو کچھ کہنے کی کوشش کی ہے، اسے تلاش کرنے کی سعی کی جائے۔

س: آپ نے جدیدیت کے زیر اثر افسانہ لکھا ہے ایسا ہمارے نقادوں کا خیال ہے اور مابعد جدیدیت والے بھی آپ کو اپنی صنف میں رکھتے ہیں۔ جدیدیت نے فرد کو اہمیت دی تھی، اور اس معاملے میں مابعد جدیدیت والے ترقی پسندوں کے تقریباً ساتھ ہیں، کیا یہ فن کے ارتقائی مدارج ہیں یا بطور فنکار آپ کبھی فرد کو اہمیت دیتے ہیں اور کبھی سماج کو؟

ج: میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرے سامنے فرد اور سماج نیز ان کے درمیان اٹوٹ رشتے کی بہت اہمیت ہے، اب یہ رشتہ ترقی پسندوں کو پسند آتا ہے، جدیدیوں کو آتا ہے یا مابعد جدیدیوں کو، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، یا میرے افسانے کو کون کس خانے میں رکھتا ہے، اس سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

س: اگر افسانہ یا کوئی فن پارہ کسی خاص سماج کی پیداوار ہے (قصیدہ ایک خاص سماج کی پیداوار تھی) تو کیا وہ آفاقی ہوسکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ کون سے عوامل ہیں جو کسی فن پارے کو آفاقی بناتے ہیں؟

ج: افسانہ آفاقی ہوسکتا ہے اور ہوا ت ہے۔ اس کے یا کسی بھی صنف ادب کے آفاقی ہونے کی بس ایک شرط ہے......فن......اعلیٰ فن۔

س: زندگی کو پیش کرتے ہوئے افسانہ لکھنا آسان ہے یا ناول یہ سوال اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ ہمارے یہاں اکثر فکشن نگاروں کو بطور افسانہ نگار یاد رکھا گیا ہے۔ ایسا تو نہیں کہ ناول کسی مخصوص تاریخی سائیکی کو نمایاں کرتا ہے اور افسانہ عصری حسیت کو؟

ج: میں تو افسانے بھی لکھتا ہوں اور ناول بھی اور دونوں مجھے آسان نہیں معلوم ہوتے، بلکہ افسانہ لکھنا زیادہ مشکل ہے کیوں کہ اس عمل میں دریا کو کوزے میں بھرنا پڑتا ہے۔ ناول لکھنے کے لیے دیر طلب غور و فکر، وقت کی فراوانی، مکمل یک سوئی اور بے حد صبر کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ ناول لکھنے میں وہ آزادی بھی رہتی ہے جو افسانے میں نہیں رہتی۔ اس میں شک نہیں کہ ناول اپنے وقت کا بہت بڑا تحریری tx Document ہے اور اس کا دائرہ بہت بڑے وقت کو اپنے احاطے میں لیتا ہے، افسانے کو یہ امتیاز حاصل نہیں، مگر کچھ افسانے ناول سے بھی زیادہ دیرپا ثابت ہوتے ہیں مثلاً منٹو کے افسانے۔

س: ہمارے افسانوں میں عورتوں کی سائیکی زیادہ ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جب کہ مرد بھی مسائل سے گھرا ہوا ہے؟

ج: میں ایسا نہیں سمجھتا۔ مردوں کی نفسیات پر بھی بہت لکھا گیا ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ عورتوں کی نفسیات مردوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ فکشن

لکھنے والوں کو وہاں زیادہ مواد ملتا ہے اور یہ گویا ان کے لیے ایک چیلنج ہے۔

س: آپ اپنے آنے والے ناول کا نام بتائیے اور اس کے تخلیقی محرکات پر روشنی ڈالیے؟

ج: ناول تو میرے دو دو مکمل ہیں مگر میں نے ابھی ان کے نام طے نہیں کیے اور ان کے تخلیقی محرکات پر ابھی کچھ کہنا مناسب نہیں ہے۔

س: بطور افسانہ نگار آپ اردو کے کس افسانہ نگار کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں؟

ج: کسی ایک کو نہیں۔ ویسے میں راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین حیدر سے بہت متاثر ہوں۔ میں قرۃ العین حیدر کو بحیثیت افسانہ نگار بہت عظیم تصور کرتا ہوں، ناول نگار سے بھی زیادہ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانے میں ان کی پوری شخصیت سمٹ آتی ہے، جب کہ ان کے ناولوں میں یہ بات مجھے محسوس نہیں ہوتی۔ راجندر سنگھ بیدی جتنے سیدھے سادے نظر آتے ہیں، اپنے بین السطور میں اتنے ہی پیچیدہ اور دل چسپ۔ وہ کوزے میں دریا کو بھرنے کا فن جانتے ہیں۔ اور اس معاملے میں ان کا کوئی ہم عصر ان کے قریب نہیں پہنچتا۔

س: آج کے سماج کی سب سے بڑی سائیکی کیا ہے؟ اور بطور فنکار اس سائیکی نے آپ کے ذہن میں کتنا اثر ڈالا۔

ج: کوئی ایک نہیں ہے۔ مجھے Contradiction سب سے زیادہ Hit کرتا ہے۔ اس کے علاوہ میں سوشل سائنس کا طالب علم ہوں، اس لیے سیاسی اور سماجی عوامل میرے ذہن پر زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔ اور بھی بہت سے محرکات ہیں۔

س: ہماری زندگی کا کون سا رخ ہے جس کو آپ نے اب تک اپنے افسانوں میں پیش نہیں کیا ہے؟

ج: زندگی کے بے شمار رخ ہیں جو ابھی تک فنکاروں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ میں فکشن کی دنیا میں اپنے آپ کو طفل مکتب سمجھتا ہوں اور مجھے ہمیشہ اس کا احساس رہا ہے کہ جو مجھے لکھنا چاہیے وہ میں نے ابھی تک نہیں لکھا۔

□□□

پتہ:103, Sutlej Hostel, JNU, New Delhi-110067

وضاحتی کتابیات [illegible]

مرتب: مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی نے قومی اردو کونسل کے ایک منصوبے کے تحت سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کے تعارف اور مختصر تبصرے پر مبنی ''وضاحتی کتابیات'' کل 22 جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ہر برس کی کتابوں کا ذکر الگ الگ جلدوں میں ہے۔ موصوف نے وضاحتی کتابیات کے متعینہ اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں متعلقہ کتاب کے بارے میں معروضیت کے ساتھ ضروری اطلاعات فراہم کردی ہیں، جن کے وسیلے سے محقق اور طالب علم مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

22 جلدوں کی مجموعی قیمت:-/2693 روپے

بیسویں صدی [illegible] کے اردو مصنفین

مصنفہ: سنجیدہ خاتون

اس کتاب میں متعلقہ دور کے مصنفین کے ابتدائی حالات، تعلیمی مراحل اور مشاغلِ حیات کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ قلم کاروں میں شعرا، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار، محققین، ناقدین، طنز و مزاح نگار اور صحافیوں کے علاوہ سوانح، تاریخ اور اسلامی لٹریچر کی نمائندہ شخصیات شامل ہیں۔ اردو میں سوانحی حوالوں کی کتابوں کی کمی کھلتی ہے، یہ کتاب اسی خلا کو پُر کرنے کی ایک کوشش ہے جو 147 ادبا کے مختصر تذکروں پر مبنی ہے۔

صفحات:570، قیمت-/137 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

اقبال حسین **(ہماری مطبوعات سے)**

شہزادہ فیروز شاہ

1857 کی پہلی جنگ آزادی کی تحریک کو کچلنے میں شریک انگریز اور یورپی افراد کے کارناموں اور حیات کو بہت سے غیر ملکی مورخین نے قلمبند کیا ہے لیکن ہندوستانی رہنماؤں، ان کی حیات اور جنگ آزادی میں ان کے کارناموں کو انھوں نے کم لکھا ہے یا نظر انداز کر دیا ہے۔ 1857 کی خونچکاں واقعات کے بعد عام طور پر ہندوستانی اہل قلم اس قدر خوف زدہ تھے کہ ان کے لیے اس موضوع پر قلم اٹھانا موت کو دعوت دینا تھا۔ ان حالات میں 1857 کی جنگ آزادی میں شریک رہنماؤں کے متعلق ہم عصر ہندوستانی مورخین یا تو خاموش ہیں یا بہت کم لوگوں نے کچھ لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں شہزادہ فیروز کے متعلق معلومات کسی ایک ماخذ سے نہیں ملتیں۔

شہزادہ فیروز شاہ کے آباواجداد کے متعلق مختلف رائیں ملتی ہیں اور یہ تمام رائیں ان مورخین کی ہیں جو ان کے ہم عصر نہیں تھے اور جنھوں نے شہزادہ کے متعلق کافی برسوں کے بعد لکھا ہے۔ تقریباً قریبی ہم عصر مورخ کمال الدین حیدر، شہزادہ فیروز شاہ کو مرزا ناظم بخت کا بیٹا اور فرخ سیر کا نواسہ بتلاتا ہے (1) انتظام اللہ شہابی آپ کو مرزا ناظم بخت کا خلف اور شاہ عالم ثانی کا پوتا بتلاتے ہیں جو بادشاہ فرخ سیر کے نواسہ تھے۔ (2) انگریز مورخین بھی اس باب میں مختلف الرائے ہیں۔ بہرحال ہمیں شہزادہ فیروز شاہ کے اعلانیہ مورخہ 25 اگست 1857 سے یہ صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ غازی کے پوتے تھے۔ (3)

شہزادہ فیروز شاہ کے ابتدائی حالات کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ غالباً 1855 میں آپ دہلی سے حج کے لیے روانہ ہوئے تھے اور مئی 1857 میں واپس ممبئی آئے تو شمالی ہندوستان میں مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں کا علم ہوا۔ وہ دہلی کی طرف چلے کیونکہ بقول تھامپسن وہ 1857 کی لڑائی کو انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے خلاف ان کی جنگ آزادی کے متعلق سلسلہ وار تفصیلات نہیں ملتی ہیں تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو برابر کی مہموں میں شریک تھے۔ یعنی اول مہم کا مقصد انگریزوں کی طاقت کو مالوہ اور مشرقی راجپوتانہ کے علاقوں میں نقصان پہنچانا اور کمزور کرنا تھا (4) اور دوم مرکزی یا وسط ہند میں انگریزوں کے خلاف ایک محاذ کھول کر، شمال کی طرف پیش قدمی کرنا تھا۔ چنانچہ اس حکمت عملی کے تحت شہزادہ فیروز جولائی سے نومبر 1857 کے دوران مالوہ کے گردونواح میں سرگرم عمل رہے۔ مالوہ کے علاقے میں روہیلہ افغانوں کی بڑی آبادیاں تھیں جیسے بھوپال، جاورا وغیرہ جہاں کے حکمران مسلمان تھے اور انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔ تاہم ان ریاستوں میں اندرونی چپقلش اور انتشار تھا۔ بالخصوص جانشینی کا مسئلہ اور دیگر خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے بہت سے افراد حکمراں طبقے سے ناراض تھے۔ بھوپال کی ولی عہدی کے معاملے میں ناراض نواب وارث محمد خان اندور میں انگریزوں کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔ بھوپال کے خاندان سے متعلق امبانی تواجین الگ انگریزوں کے خلاف محاذ آرا تھے۔ (5) ٹونک کے نواب وزیرالدولہ نے انگریزوں کا حلیف رہنا ہی پسند کیا لیکن اس کے چچا کو انگریز مخالف ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ماموں میر عالم خاں کو شہید کر دیا گیا۔ جاورا کا نواب انگریزوں کے ساتھ تھا لیکن اس کا قریبی عزیز عبدالستار خاں شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ آملا تھا اور وہ فروری 1859 تک جنگ کرتا رہا۔

مالوہ اور اس کے گردونواح میں عرب اور روہیلہ پٹھانوں کی بڑی تعداد ان سپاہیوں کی تھی جو حیدرآباد اور دیگر ریاستوں سے فوجی ملازمتوں سے تخفیف کر دیے گئے تھے۔ یہ لوگ بے کاری اور معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ تاہم بقول میک من یہ لوگ باغیانہ عزائم کے باوجود بڑی حد تک بے ضرر تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی کمان میں تعینات فوج پورے علاقے میں یا تو باغی ہو چکی تھی یا بغاوت کے قریب تھی۔

4 جون 1857 کو نیمچ میں متعین فوج، 8 جون کو نصیر آباد کی فوج اور 14 جون 1857 کو گوالیار کی فوج نے بغاوت کردی۔ (6) اندور میں وارث محمد خاں، سعادت خاں بے کاری کے شکار فوجی عہدہ داران اور مولوی عبدالصمد ایک پرجوش مجاہد آزادی کی رہنمائی میں جنگ کر رہے تھے۔ مہو میں متعین فوج

اٹھارہ سو ستاون کے راہ نما سے ماخوذ، / صفحات۔276 ، قیمت : -/349روپے

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

مراد علی کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف کھڑی ہوگئی۔ (7) اس دن دھار میں متعین فوجیوں نے بھوپاوار اور سردر پور میں انگریزی چوکیوں کو نذرِ آتش کردیا۔ 31 اگست 1857 کو مجاہدین آزادی دھار کے قلعے پر قبضہ کر چکے تھے۔ امجھیرا اور جھبوا کے راجاؤں کی فوج میں زیادہ تر عرب تھے وہ انگریزوں کے مخالف تھے اور مجاہدین کے ساتھ شامل ہوکر ان کی مدد کرنے لگے۔ (8) ان کا مطالبہ تھا کہ یورپی بھگوڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ گرد و نواح میں انگریزوں کے خلاف پھیلی ہوئی نفرت اور غصہ کو دیکھتے ہوئے شہزادہ فیروز شاہ نے اس علاقے سے جنگ آزادی چھیڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہر چند کہ شہزادہ فیروز شاہ کے پاس وسائل اور فوج کی کمی تھی، تاہم ان کی شخصیت کا مثبت پہلو یہ تھا کہ وہ مغل شاہزادہ تھے، بہادر شاہ ظفر کے پوتے تھے اور اب مکہ معظمہ سے حج کر کے لوٹنے کے بعد ان کی مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی اہمیت اور قدر و قیمت بڑھ گئی تھی۔ اس لیے دہلی سے دور وسط ہند کا یہ علاقہ انگریز مخالف سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ عام مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کرنے میں مولوی حضرات کا بھی بڑا ہاتھ تھا جو جہاد کی فضیلت بیان کر کے مسلمانوں میں جہادیوں کی ایک رضاکار جماعت بنانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

جولائی 1857 میں مندسور کی فتح کے بعد مہاراجہ سندھیہ کی فوج سے بغاوت کر کے بہت سے افغان اور دیگر غیر ملکی فوجی شہزادہ فیروز شاہ کی کمان میں آگئے، میواتیوں کی بھی بڑی تعداد شہزادے کی فوج میں شامل ہوگئی تھی۔ شہزادہ فیروز شاہ کی فوج میں ہر طبقہ و مذہب کے لوگ شامل تھے۔ ایک برٹش اندازے کے مطابق 5000 میواتی، 500 افغان، بھیم نائک کی کمان میں اور 200 بھیل، 400 مکرانی، اور 3000 مختلف طبقات کے لوگ اور 1000 گھوڑ سوار شہزادے کی قیادت میں پہلی جنگ آزادی میں شریک تھے۔ (9)

شہزادہ فیروز نے مندسور پر قبضہ کرنے کے بعد انتظامیہ کی طرف توجہ دی اور مرزا جی اجارہ دار مہد پور کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اپنے انتظامیہ کو مستحکم کرنے کے لیے شہزادہ نے قرب و جوار کے راج گھرانوں جیسے پرتاپ گڑھ، جاورہ، سیتامئو، رتلام اور سالمبر کو خطوط بھیجے (10) کہ وہ اس کی حکومت کو تسلیم کرلیں اور بارود اور اسلحہ جات کے ساتھ روپیہ بھی فراہم کریں۔ شاور (Shower) کے مطابق کئی راج گھرانے شہزادہ کے ساتھ ہوگئے۔ (11)

مندسور میں شہزادہ فیروز شاہ کے اقدامات اور بتدریج اس کی مستحکم ہوتی ہوئی قوت انگریزوں کے لیے باعث فکر تھی۔ انگریزوں کا ممبئی سے براہ راست رابطہ خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ستمبر 1857 میں فیروز شاہ کی کمان میں اٹھارہ ہزار افراد تھے۔ شہزادہ فیروز، کوٹہ کے مجاہدین آزادی سے بھی رابطہ بنائے ہوئے تھے جنھوں نے انگریزوں کے حلیف مہاراؤ کو اکتوبر 1857 میں قید کرلیا تھا۔ انگریزوں نے شہزادہ فیروز کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کے لیے ڈیورینڈ اور اسٹیورٹ کی قیادت میں فوج بھیجی جس کی وجہ سے جاورہ کے نواب کو مجاہدین آزادی کا ساتھ دینے کی ہمت نہیں ہوسکی۔ (12)

ریاست حیدرآباد میں 12 جون کو جہاد کا سبز پرچم بلند کیا گیا۔ (13)

17 جولائی 1857 کو روہیلہ سردار طرہ باز خاں نے مولوی علاء الدین کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ (14) لیکن اُمرائے دکن اور والیِ حیدرآباد کا رویّہ مجاہدین کے حق میں نہ تھا جس کی وجہ سے انگریزوں نے بڑی تیزی کے ساتھ دکن کے مختلف حصوں پر اپنا اقتدار بحال کرلیا اور اندور کے مجاہدین کی راہ مندسور سے منقطع کردی جس کی وجہ سے مجاہدین دو حصوں میں بٹ کر رہ گئے۔ انگریزی فوج نے اسٹیورٹ اور ڈیورینڈ کی قیادت میں یکے بعد دیگرے دھار، جیرن وغیرہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ جمالیا اور پیش قدمی کرتی رہی۔ شیخ رحمت اللہ نے مہد پور کے مجاہدین کی قیادت سنبھال لی تھی لیکن میجر اُر نے، ان کو راول کے مقام پر 13 نومبر 1857 کو شکست دے دی۔ (15)

دریں اثنا شہزادہ فیروز شاہ نے جو 8 نومبر تا 22 نومبر 1857 نیچ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، انگریزی افواج کی پیش قدمی اور کامیابیوں سے مجبور ہوکر محاصرہ اٹھا لیا۔ 24 نومبر کو مالوہ پر اقتدار کی فیصلہ کن جنگ گرا ریا کے مقام پر ہوئی۔ (16) شہزادہ فیروز شاہ کی دفاعی کوششوں کی وجہ سے انگریزوں کو مندسور پر قبضہ کرنے میں کافی مشکلات پیش آئیں۔ صورت حال شہزادہ فیروز شاہ کے لیے بہت نازک ہو چکی تھی۔ وہ مندسور چھوڑ کر نگوہ چلے آئے۔ (17)

شہزادہ فیروز نے اپنی فوج کو دوبارہ منظم کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ وہ مالوہ سے شمالی ہند چلے آئے۔ آگرہ میں وزیر خاں ان کے ساتھ ہوگئے۔ شہزادے نے 17 فروری 1858 کو ایک اعلانیہ جاری کیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے پر زور دیا گیا تھا اور انگریزوں کے ساتھ جنگ کی اپیل کی گئی تھی۔ یہ بھی اصرار کیا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں اس مذہبی جنگ میں شریک ہوں اور انگریزوں کو ملک بدر کردیں۔ (18)

مارچ 1858 میں شہزادہ فیروز اودھ میں موجود تھے۔ غالباً ان کا منصوبہ تھا کہ وہ احمد اللہ شاہ اور خان بہادر خاں کی افواج کے ساتھ مشترکہ طور پر محاذ آرا ہوں لیکن اودھ کے حالات، اندرونی مناقشوں اور درباری ریشہ دوانیوں کی وجہ سے سازگار نہ تھے۔ احمد اللہ شاہ اپنی جنگی صلاحیتوں اور فوج کی وجہ سے ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔ اودھ میں اقتدار کی جنگ بھی جاری تھی۔ بیگم حضرت محل اپنے بیٹے برجیس قدر کے پردے میں نام نہاد حکمراں تھیں۔ دریں اثنا احمد اللہ شاہ نے بھی بادشاہت کا اعلان کردیا جس کی وجہ سے شہزادہ فیروز شاہ بھی خوش نہیں رہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادہ فیروز شاہ کی فوج گھٹ کر چند سو افراد پر

رہ گئی۔ 18 مارچ 1858 کو لکھنؤ پر انگریزوں کے حملے کے وقت وہ لکھنؤ کے دفاع میں سب کے ساتھ شریک تھے۔ لکھنؤ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد وہ بریلی خان بہادر خاں کے پاس چلے گئے۔ 22 اپریل 1858 کو روہیلہ پٹھانوں اور 12 ویں غیر مستقل گھوڑ سوار فوج کے جہادی فوجیوں کے ساتھ مراد آباد پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن 27 اپریل کو بریگیڈیر جونس کی پیش قدمی کی وجہ سے وہ بریلی لوٹ آئے۔ (19)

مئی کے آغاز سے ہی انگریزوں کی فوجی مصلحت متفقہ طور پر یہ قرار پائی تھی کہ روہیل کھنڈ پر مکمل قبضہ کر لینا ضروری ہے۔ انگریزی افواج نے چاروں طرف سے بریلی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ 5 مئی کو فیروز شاہ اور انگریزوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ فیروز شاہ کے ساتھ غازیوں کی ایک مختصر جماعت تھی۔ یہ لوگ صرف تلواروں، خنجروں اور بھالوں سے لیس تھے اور ان کی مخالف فوج جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ غازیوں کی جرأت اور شجاعت کا اعتراف ایک انگریز فوجی اس طرح کرتا ہے:

”غازی بھلے لوگ تھے۔ یہ بھوری داڑھیوں والے معمر لوگ سبز عمامے اور کمر بند کے ساتھ، اور ان میں ہر ایک کے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی تھی جس پر قرآن پاک کی چند آیات کندہ تھیں، ڈھالوں کے نیچے سر جھکائے ہوئے حملہ آور ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں لپکتی ہوئی تلواریں تھیں جو ان کے سروں پر گردش کر رہی تھیں۔ وہ دین، دین کا نعرہ لگا رہے تھے اور مجذوبوں کی طرح رقصاں تھے۔“ (20)

بریلی میں شہزادہ فیروز شاہ اور دیگر سربرآوردہ مجاہدین آزادی کو شکست ہوئی۔ تاہم انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ تمام اہم مجاہدین آزادی جیسے احمد اللہ شاہ اور بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ انگریزی فوج کیمبل کی قیادت میں بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ 18 مئی کو کیمبل نے مجاہدین آزادی کو شاہ جہاں پور اور محمدی سے بے دخل کر دیا۔ 5 جون کو احمد اللہ شاہ کی شہادت (21) سے مجاہدین کے حوصلے پست ہو گئے تاہم فیروز شاہ نے جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ 10 جون 1858 کو وہ بانگر مئو کے گرد و نواح میں اپنی فوج کے ساتھ انتظامیہ کی بحالی میں مصروف تھے۔ (22) انھوں نے علاقے کے زمینداران کی اعانت حاصل کرنے کے لیے یہ اعلان جاری کیا کہ جو لوگ ان کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوں گے ان سے تین سال تک مال گذاری نہیں لی جائے گی۔ انھوں نے اللہ داد خاں کو بانگر مئو کا تحصیلدار مقرر کیا اور نرپت سنگھ کی فتح پور چوراسی کی تقرری کے لیے راہ ہموار کی۔ (23) فیروز شاہ نے صفی پور کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ (24) ان کی مدد سیتل گنج کے افغان اور میواتی زمینداران کر رہے تھے۔ بہت سے علما اور ایک بزرگ جو لکڑ شاہ کے نام سے مشہور تھے، ان کے ساتھ 16 جولائی 1858 کی موہان اور ملہا کی مہم میں شریک تھے۔ (25)

جولائی اور اگست 1858 میں فیروز شاہ کی انگریزی فوج سے رحیم آباد اور سندیلہ میں جنگ ہوئی۔ انھیں پسپا ہونا پڑا کیونکہ کوانگ نے ان کو ہر طرف سے گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ مجبور ہو کر شہزادہ نیپال کی طرف چلے گئے۔ ستمبر اور اکتوبر 1858 وہ دوبارہ ہندوستان میں نورنگ آباد اور سیتاپور کے علاقوں میں کچھ اور مغل شہزادوں کے ساتھ دیکھے گئے تھے۔ (26) اکتوبر 1858 میں خان بہادر خاں اور شہزادہ فیروز، بیتاؤلی کے راجہ سے مدد حاصل کر کے دوبارہ انگریزوں سے مقابل ہوئے۔ لیکن بیتاؤلی کی جنگ میں ہار گئے۔ راجہ نرپت سنگھ اور لکڑ شاہ ان کی مدد کے لیے موجود تھے۔ (28)

یکم دسمبر 1858 کو لکھنؤ سے پچاس میل شمال مغرب میں واقع بسوا میں مجاہدین آزادی اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ (29) فیروز شاہ شکست کے بعد نیپال کے جنگلوں میں چلے گئے لیکن 11 دسمبر 1858 کو 2500 افراد کی جمعیت کے ساتھ قنوج کے قریب گنگا عبور کر کے بندیل کھنڈ میں تانتیا ٹوپے کی فوج کے ساتھ آ ملے۔ سر ہیپر کی قیادت میں انگریزی فوج سے شہزادے کی فوج کا مقابلہ ہوا جو یک طرفہ ثابت ہوا۔ شہزادے کی فوجی طاقت نہ کے برابر تھی۔ 13 جنوری 1859 میں اندر گڑھ میں شہزادہ فیروز اور تانتیا ٹوپے پھر ساتھ ہو گئے۔ لیکن دونوں کی مشترکہ فوج مشکل سے دو ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ (30) 21 جنوری کو سیکر میں مجاہدین کی مشترکہ فوج کی پھر ہار ہوئی۔ تانتیا ٹوپے اور شہزادہ فیروز کے گروہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ کچھ دنوں تک شہزادہ فیروز، نانا صاحب کے بھتیجے راؤ صاحب کے ساتھ سرونج کے جنگلوں میں بھٹکتے رہے۔ میدانی جنگ میں انگریزی فوج سے مقابلہ مشکل دیکھ کر مجاہدین آزادی نے تانتیا ٹوپے کی قیادت میں گوریلا جنگ شروع کر دی تھی۔ (31) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقل جنگ آزمائی اور جابجا دربدری کی وجہ سے شہزادہ فیروز اور ان کے رفقا وقتی طور پر مفاہمت کی سیاست پر آمادہ ہو گئے تھے۔ انگریزوں سے مفاہمت کی شرائط میں شہزادہ نے مغلوں کے وقار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وسط ہند میں انگریز ایجنٹ اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”وہ تیمور شاہ کے خاندان کے ایک شہزادے کی طرح تمام القاب و آداب کا استعمال کرتا ہے اور بہت سے مطالبات جیسے کہیں بھی آنے جانے کی آزادی، مستقبل میں اس کے رفیقوں کے گذارہ کے لیے معقول انتظامات اور ہتھیار رکھنے کی پوری آزادی وغیرہ۔ مطالبات ناقابل قبول ہیں۔“ (32)

مجاہدین آزادی کے لیے حالات بہت مشکل ہوتے جا رہے تھے۔ شمالی ہند میں وہ پسپا کیے جا چکے تھے، وسطی ہندوستان میں راؤ صاحب اور شاہزادہ

فیروز کی جہد آزادی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ 11 فروری 1859 کو بریگیڈیر ہومز نے شہزادہ فیروز اور راؤ صاحب کی مختصر فوج کو شانہ کے مقام پر شکست دی۔ (33) ان شکستوں کے باوجود شہزادہ نے انگریزوں کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ 20 اگست 1859 کو، ساگر کے جنگلوں میں پتری کے مقام پر جنرل ہاٹ نے انھیں گھیر لیا تھا۔ شہزادے جان بچا کر اندرون جنگل چلے گئے اور برسوں بھٹکتے رہے۔ بعد ازاں وسط ایشیا اور ایران کا رخ کیا۔ غالباً وہ ان علاقوں کے حکمرانوں سے فوجی امداد حاصل کر کے جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 1861 اور پھر 1863 میں امیر بخارا سے بھی ملے تھے لیکن کوئی کامیابی نہ حاصل کر سکے کیونکہ امیر بخارا خود روس کے خطرات سے دوچار تھے۔ شہزادہ فیروز 1868 میں کابل بھی گئے تھے لیکن امیر کابل انگریزوں کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتے تھے اس لیے شہزادے کو مایوس ہونا پڑا۔ (34)

اکتوبر 1873 میں شہزادہ فیروز کے متعلق برطانوی سفیر مقیم ترکی نے خبر دی تھی کہ وہ استنبول میں رہ رہے تھے۔ جولائی 1873 میں انگریزوں کو خبر ملی کہ شہزادہ مکہ کی جانب جا چکے ہیں۔ جون 1875 میں شہزادہ مکہ میں تھے اور 17 دسمبر 1877 کو وہیں ان کا انتقال ہوا۔ آخر وقت تک ان کی شریک حیات سلطان زمانی بیگم ان کے ساتھ تھیں۔ 1881 میں لارڈ رپن نے زمانی بیگم کے گزارے کے لیے سو روپیہ ماہانہ کی رقم اس شرط پر دی تھی کہ وہ دہلی لوٹ کر نہیں جائیں گی۔ (35)

●

شہزادہ فیروز شاہ کی زندگی کا بیشتر حصہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں گزرا۔ جنگ آزادی کے دوران انھوں نے تین اعلانیے اردو میں جاری کیے تھے جو اس وقت عوام کی زبان تھی۔ افسوس ہے کہ اب ان اعلانیوں کے اردو متن نہیں ملتے۔ تاہم انگریزوں نے اپنے مقصد کے لیے ان اعلانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرایا تھا جو مختلف کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ ان کا پہلا اعلانیہ 25 اگست 1857 کو شائع ہوا جس کا انگریزی ترجمہ موجود ہے۔ افسوس ہے کہ مورخین نے اسے بہادر شاہ ظفر کے اعلانیہ سے منسوب کر دیا ہے جو غلط ہے۔ اس اعلانیہ میں واضح طور پر لکھا گیا ہے: ''میں جو ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ کا پوتا ہوں دورہ کرتے ہوئے ہندوستان کے مشرقی علاقے میں رہنے والے کافروں کو ختم کرنے، اور ان کے آہنی استبدادی نظام حکومت میں کراہتے ہوئے غریب اور لاچار لوگوں کو آزاد کرانے کے لیے مجاہدین آزادی کی مدد سے محمدی علم بلند کر کے اور راسخ العقیدہ ہندوؤں کو آمادہ کر کے، جو میرے اجداد کی رعایا تھے اور اب انگریزوں کا استیصال کرنے کے لیے، مہاویری جھنڈا بلند کر چکے ہیں، آ گیا ہوں۔''

شہزادہ فیروز کا یہ اعلانیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سو سال کے دور حکومت میں، ہندوستان کے باشندوں کی بے بسی، غربت، لاچاری اور استحصال کی کہانی کی تلخیص پیش کرتا ہے۔ اس اعلانیہ کے آغاز ہی میں بتلایا گیا ہے کہ اس دور کے ہندوستان میں، ہندو اور مسلمان دونوں ہی انگریزوں کے مظالم اور فریب سے تباہ تھے۔ اس لیے ہندوستان کے تمام خوشحال گھرانوں سے جنگ آزادی میں مدد کی اپیل کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ کس طرح عوام کی بہبودی کے لیے دہلی کے شاہی خاندان کے افراد، ہندوستان، ایران، توران اور افغانستان کے مختلف حصوں میں پھیل کر آزادی کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ بہت سے ہندو اور مسلمان حکمران بھی عرصے سے اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنے مذہب کے تحفظ اور ہندوستان سے انگریزوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں، اس اعلان میں عوام کو یہ بھی آگاہی دی گئی ہے کہ وہ انگریزوں کے پٹھوؤں کے بہکاوے میں آ کر موجودہ معمولی تکالیف سے، جو انقلاب کا لازمی جز ہیں، یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ بادشاہی نظام قائم ہو جانے کے بعد ان کو اسی طرح کی تکلیفوں کا سامنا کرنا ہوگا۔''

اس اعلانیے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصہ ملک میں رہنے والوں کو درپیش مسائل کو یکے بعد دیگرے پیش کرتا ہے۔

اعلانیے کا پہلا حصہ انگریزی حکومت کے دور میں زمینداروں پر بھاری جمع لاگو کر کے ان کو کس طرح برباد اور رسوا کیا گیا تھا کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ رعیت کس طرح برباد ہوئی۔ زمینداریاں کیوں اور کس طرح نیلام کی گئیں۔ عدالتوں میں مقدمات کی پیشی کے لیے اسٹامپ ڈیوٹی کا نفاذ اور برسوں تک مقدمات کو لٹکا کر لوگوں کو منصوبہ بند طور پر برباد کرنا، اعلانیے کے خاص پہلو ہیں۔ ان تفصیلات کی وضاحت کے بعد عوام کو یقین دلایا گیا ہے کہ بادشاہی حکومت کے قیام کے بعد ان تمام خرابیوں کو دور کر دیا جائے گا اور مقدمات کا فیصلہ شرع اور شاستروں کی روشنی میں کیا جائے گا۔

حصۂ دوم میں بتایا گیا ہے کہ انگریزی حکومت نے کس طرح فریب کے ساتھ تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے تمام اہم سامان تجارت جیسے نیل، کپڑے اور دوسرے قسم کے مال تجارت کی برآمد پر قبضہ کر لیا تھا اور معمولی اشیا کی تجارت عام لوگوں کے لیے چھوڑ دی تھی اور اس تجارت میں بھی انھوں نے بلاواسطہ اپنا حصہ اسٹامپ فیس، کسٹمز وغیرہ کے ذریعے برقرار رکھا تھا۔ علاوہ ازیں معمولی تاجروں کے منافعے پر کئی طرح سے ٹیکس عائد کر دیے گئے تھے جن کی عدم ادائیگی پر ان کو سزا دی جاتی تھی۔ اس لیے اس اعلانیے میں وعدہ دہرایا

گیا تھا کہ بادشاہی حکومت قائم ہونے کے بعد یہ تمام برائیاں دور کردی جائیں گی اور تاجروں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ دامے، درمے، قدمے اور سخنے، ہر طرح سے انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں مدد کریں۔

اعلامیے کے تیسرے حصے میں سرکاری ملازمین سے براہ راست خطاب کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ انگریزی حکومت میں ہندوستانیوں کو شہری اور فوجی ملازمتوں میں کوئی عزت حاصل نہیں ہے۔ ان کی تنخواہیں کم ہیں اور ان کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ تمام بڑے اور وقار کے عہدوں پر بڑی بڑی تنخواہوں پر صرف انگریزوں کا تقرر ہوتا ہے جب کہ ہندوستانیوں کو معمولی تنخواہ اور ملازمتوں پر مقرر کیا جاتا ہے۔ فوج میں ان کا سب سے بڑا عہدہ صوبہ دار کا ہے جس کی تنخواہ ساٹھ روپئے ماہانہ ہے اور سول سروسز میں بھی ہندوستانیوں کا اعلیٰ ترین عہدہ صدر اعلیٰ تک محدود ہے جس کی ماہانہ تنخواہ پانچ سو روپئے ہے۔ نہ ان کا کوئی اثر ہے اور نہ ہی ان کو کوئی جاگیر ملتی ہے۔ اعلامیے میں وعدہ کیا گیا ہے کہ بادشاہی حکومت میں اعلیٰ عہدوں جیسے کرنل، جنرل اور کمانڈر انچیف وغیرہ پر ہندوستانیوں کو مقرر کیا جائے گا جو اس وقت انگریزوں کے پاس ہیں اور سول سروسز میں وہ کلکٹر، مجسٹریٹ، صدر، جج، گورنر جیسے اہم عہدوں پر بھی فائز کیے جائیں گے جن پر فی الحال یورپی ممالک کے لوگ قابض ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو وزیر، قاضی، سفیر، صوبہ ناظم اور دیوان کے عہدوں پر بھی فائز کیا جائے گا جن پر ان کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جائیں گی۔

اعلانیے کا یہ حصہ قابل غور ہے: ہندوستانی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، اگر انگریزوں کے خلاف جنگ میں شہید ہوتے ہیں تو یقینی طور پر جنت میں جائیں گے اور وہ جو انگریزوں کے لیے جنگ کریں گے بلا شبہ دوزخ کا نوالہ بنیں گے۔ اس لیے تمام ہندوستانی جو انگریزوں کی ملازمت میں ہیں اپنے مذہب اور مفاد سے آگاہ ہوں اور ان کی ملازمتوں کو چھوڑ کر بادشاہی حکومت میں شامل ہو جائیں اور فی الحال دو سو سے تین سو روپیہ ماہانہ تنخواہ حاصل کریں اور آئندہ بڑی ملازمتوں کی توقع کریں۔

شہزادہ فیروز شاہ کے اعلامیے کے چوتھے حصے میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستانی صنعتوں کی بربادی اور دستکاروں کی بدحالی کا بیان کیا گیا ہے۔ دستکاروں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ انگریزی حکومت کی ملازمت سے الگ ہو جائیں اور مجاہدین کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک ہو جائیں۔ ان کو بادشاہی حکومت اور بادشاہ کے تابعدار ہمنوا راجاؤں اور نوابوں کے دربار میں ملازمت ملے گی جو ان کی خوش حالی کی ضمانت ہوگی۔

اعلانیے کے آخری حصے میں پنڈتوں اور علما کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے رکھوالے ہیں اور انگریز دونوں مذاہب کے دشمن ہیں اس لیے انگریزوں کے خلاف جاری جنگ آزادی، اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے ہے۔ اس لیے پنڈتوں، علما اور فقیروں کو اس میں میرے ساتھ شریک ہوکر جہاد کرنا چاہیے ورنہ شرع اور شاستروں کی رو سے ان کی ملامت ہوگی۔ اعلامیے میں یہ بھی وعدہ کیا گیا ہے کہ بادشاہی حکومت کے قیام کے بعد ان کو معافی کی زمینیں دی جائیں گی۔

یہ اعلانیہ اس انتباہ کے بعد ختم ہوتا ہے کہ اگر اس اعلامیے کی تقسیم کے بعد مندرجہ بالا طبقوں کے لوگ انگریزوں کے ساتھ رہے تو ان کی جائیدادیں ضبط کرلی جائیں گی اور ان کا مال و متاع لوٹ لیا جائے گا اور ان کو مع ان کے اہل خاندان کے قید کرکے بالآخر موت کی سزا دی جائے گی۔ (36)

حواشی:

1. قیصر التواریخ، جلد دوم، ص465
2. غدر کے چند علما، دہلی، ص132
3. یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مورخین نے یہ اعلانیہ بالعموم بہادر شاہ ظفر کے نام منسوب کر دیا ہے جو شہزادہ کے اپنے بیان کے مطابق یہ اعلانیہ خود اس کا تھا۔ دیکھیے، اطہر عباس رضوی، فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش جلد اول، لکھنؤ، 1857، Charles Ball, The History of the Indian Mutiny, Vol. II, pp. 630-632
4. تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ دی رولٹ ان سنٹرل انڈیا، 1857-59، انٹیلیجنس برانچ، آرمی ہیڈکوارٹرس، انڈیا، شملہ 1908 صفحات 14، رولف ایچ تصور پے، شہزادہ فیروز شاہ، بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جولائی تا دسمبر 1969, 138-135
5. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص-138
6. دی رولٹ ان سنٹرل انڈیا، صفحات 62-49، بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، صفحات 137-38
7. رولٹ ان سنٹرل انڈیا، صفحات 83,81,75,62,49 بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، صفحہ 138
8. رولٹ ان سنٹرل انڈیا، صفحات 75-83، بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص-137
9. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، صفحات 41-139
10. ایضاً، ص-139
11. سی ایل، شاورس، اے مسنگ چیپٹر آف دی انڈین میوٹنی (1888) بحوالہ بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ
12. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص ص 141-140
13. ایضاً، صفحہ 140
14. ایضاً
15. ایضاً
16. ایضاً، صفحہ 141

17. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص 141
18. رضوی، فریڈم اسٹرگل، جلد اول، صفحات 60-459
19. بنگالی پاسٹ اینڈ پریزنٹ، صفحات 45-143
20. تاریخ احمدی، مرتبہ ابرارحسن فاروقی، لکھنؤ 1925، ص -114 فضل حق خیرآبادی، الثورۃ الہندیہ، ص -410
21. رضوی، فریڈم اسٹرگل، جلد دوم، صفحات 40-399
22. ایضاً، ص 400
23. ایضاً ص 400
24. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جنوری۔ جون 1969، ص 46-145
25. رضوی، فریڈم، اسٹرگل، جلد دوم، ص 656
26. رضوی، فریڈم اسٹرگل، جلد دوم، ص 518
27. فارن پولیٹیکل کنسلٹیشن، 15 جولائی 1859، نمبر 64-261 نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی
28. رضوی، فریڈم اسٹرگل، جلد دوم، ص 656
29. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جنوری۔ جون 1970، ص 43
30. ایضاً، ص 44
31. رضوی، فریڈم اسٹرگل...... جلد سوم، ص 669
32. فارسٹ ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی، جلد سوم، ص 602
33. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جنوری۔ جون 1970، صفحات 46-44
34. ایضاً، صفحہ 46
35. اعلانیہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ چارلس بال، دی ہسٹری آف انڈین میوٹنی، جلد دوم صفحات 630-632
36. فریڈم اسٹرگل ان یوپی۔ جلد اول، صفحات 453-485

□□□

منتخب التواریخ (جلد اول، دوم، سوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاثمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبرنامہ'' کے ساتھ ساتھ ملاّ عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملاّ عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبرنامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم و سوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے/ جلد دوم و سوم 555 روپے

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

''جتنے پاس اتنے دور'' انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی. گھا نے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت -/145 روپے

اردو خبر نامہ

وزارت ترقی انسانی وسائل کے نئے عزائم

● نئی دہلی۔ 2 جون، وزارت فروغ انسانی وسائل کے نئے سربراہ جناب کپل سبل نے جنھوں نے تعلیمی اداروں میں شفافیت لانے، ان کی ذمے داریاں طے کرنے اور درس گاہوں میں غیر اخلاقی سرگرمیوں پر روک لگانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جناب کپل سبل کے مطابق ''اس اصلاح کا مقصد بہتر تعلیمی نظام کی فراہمی ہے جس میں سبھی کو مساوی حقوق حاصل ہوں اور ملک کے سبھی طبقے اپنا جائز تعلیمی حق پائیں۔''

اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے جناب سبل صاحب نے کہا کہ ''میں تعلیمی نظام کی مکمل تشکیل نو کا عزم رکھتا ہوں جس کی حد درجہ ضرورت ہے۔ کالجوں کے ذریعے کیپٹیشن فیس لینے پر روک لگائی جائے گی، اعلیٰ تعلیم کی تنظیم نو کی جائے گی، نجی تعلیمی اداروں کی چھان بین ہوگی اور سماج کے ہر طبقے تک تعلیم کی رسائی یقینی بنائی جائے گی۔''

محترم سبل صاحب کا خیال ہے کہ اساتذہ کی صلاحتوں کو نکھارنے کے لیے وقتاً فوقتاً، ٹریننگ پروگرام ہونے چاہییے تاکہ پس ماندہ علاقوں میں بھی بہتر تدریسی نتیجے حاصل کیے جاسکیں۔ موجودہ دور میں کنویں کے مینڈک بن کر نہیں جیا جاسکتا بلکہ گلوب کے چاروں طرف کے حال چال سے واقفیت ضروری ہے۔

سبل صاحب نے کہا کہ ملک کے تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلی وقت اور حالات کا تقاضہ ہے۔ بے روزگاری ہندوستان کا ایک اہم مسئلہ ہے اور تعلیم اور روزگار کے بیچ ایک گہرا تعلق ہے۔ کم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے روزگار کے وسائل محدود ہو جاتے ہیں اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ تعلیم گھر گھر پہنچے جس سے ملک کا ہر باشندہ فیض یاب ہو۔ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کی طرف سے چلائے جانے والے مختلف تعلیمی پروگرام بھی اس کڑی کا ایک حصہ ہوں گے۔

کپل سبل صاحب پورے تعلیمی نظام کو ازسر نو تشکیل کرنے کا عزم رکھتے ہیں اس کے لیے سب سے اہم مسئلہ وسائل کی فراہمی کا ہے۔ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کا لائحۂ عمل اس طرح وضع کیا جارہا ہے کہ موجودہ وسائل کو حسب ضرورت مساوی طور پر تقسیم کیا جاسکے۔ سبل صاحب کی آمد سے نہ صرف وزارت میں ایک نئی سرگرمی دیکھنے میں آرہی ہے بلکہ تعلیمی شعبے سے وابستہ ہر شخص پرامید نظر آرہا ہے۔

فروغ انسانی وسائل کی وزارت میں آئندہ 100 دن کے لیے جو نشانہ مقرر کیا گیا ہے اس میں کریمی لیئر سے الگ طلبہ کو کم سود پر تعلیمی قرض مہیا کرانے کا ایک منصوبہ اور ہندوستان میں غیر ملکی تعلیمی اداروں کو باضابطہ بنانے کے لیے ایک بل لانا شامل ہے۔ وزارت کے ایک سینئر افسر نے پی ٹی آئی کو بتایا کہ وزیراعظم کی جانب سے طے شدہ میعاد کے مطابق ہم نے آئندہ 100 دن کے لیے ایک اسکیم تیار کی ہے۔ وزارت کا منصوبہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی مدد سے سبھی ریاستوں میں آزادانہ ریاستی اعلیٰ تعلیمی کونسل قائم کرنا بھی ہے۔ ابھی کچھ ریاستوں میں یہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں 100 نئے خواتین ہاسٹل اور 10 نئے قومی صنعتی اداروں کی منظوری کا بھی منصوبہ ہے۔ سرکار تعلیمی اداروں میں تعلیمی اصلاح بھی کرے گی۔ یو. جی. سی. نے اس کے لیے رہنما اصول تیار کیے ہیں جسے یونیورسٹیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سرکار کو اقتصادی طور پر پسماندہ ہونہار طلبہ کو کم شرح سود پر تعلیمی قرض دینے کی نئی اسکیم پر عمل درآمد کی امید ہے۔ منصوبے کو کابینہ سے منظوری کا انتظار ہے۔

ریزرویشن کے لیے آئین میں تبدیلی زیر غور

● نئی دہلی۔ 11 جون، اقلیتی امور کے وزیر جناب سلمان خورشید نے آج کہا کہ مسلمانوں کے لیے ترقیاتی منصوبوں کے بہتر نتائج پانے کی کوشش میں ریاستوں سے سیاسی مذاکرات کرنے کے بارے میں وہ وزیراعظم من موہن سنگھ اور کانگریس سربراہ محترمہ سونیا گاندھی سے مداخلت کی اپیل کریں گے۔ جناب من موہن سنگھ اور محترمہ سونیا گاندھی کی مداخلت کی ضرورت کے بارے میں پوچھے جانے پر انھوں نے کہا کہ میری بات کا اتنا وزن نہیں ہوگا جتنا وزیراعظم یا کانگریس صدر کا۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ بجٹ میں مسلمانوں کے لیے اسکالرشپ میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں وہ وزیر مالیات سے بات کریں گے۔ جناب سلمان خورشید نے کہا کہ اس سلسلے میں ریاستی حکومتوں کے ساتھ ہمارا اچھا تال میل ہونا چاہیے۔ میں دو قدم آگے بڑھ کر ان سے بات کرنے کی پہل کرنے کو تیار ہوں، کیونکہ ملک کے لیے یہ اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ اقلیتوں کے ترقیاتی منصوبے نافذ کرنے کی ذمے داری ریاستوں پر ہے، مرکز تو صرف ان منصوبوں کے لیے رقم فراہم کراتا ہے۔ یہ پوچھے جانے پر کہ ان منصوبوں کو نافذ کرنے میں کیا رکاوٹیں ہیں؟ انھوں نے کہا کہ رکاوٹ تو کوئی نہیں لیکن ریاستوں سے بہتر تال میل کی ضرورت ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

وزیر اقلیتی امور کی اقلیتوں کا تحفظ یقینی بنانے کی کوشش

● نئی دہلی۔ 2 جون، یو پی اے حکومت فرقہ وارانہ فساد کے خلاف پارلیمنٹ میں بل پیش کرانے اور اقلیتوں کو تحفظ دینے کی بھرپور کوشش کرے گی۔ حکومت سچر کمیٹی کی سفارشات کو عمل میں لانے کے لیے اقلیتی فرقے کی سرگرم ساجھیداری کی بھی کوشش کرے گی۔ اقلیتی امور کے وزیر جناب سلمان خورشید نے پی ٹی آئی کو بتایا کہ میری وزارت پوری کوشش کرے گی کہ گذشتہ حکومت کے وقت سے زیر التوا ''کیونل وائلنس ایکٹ'' پاس ہو۔ اقلیتوں کے تحفظ کے مقصد سے لائے گئے بل میں فسادات کے لیے ذمے دار لوگوں کے خلاف سزا دینے کا التزام ہے۔ جناب سلمان خورشید نے حالانکہ تعین وقت سے گریز کیا اور کہا کہ اس پر وزارت داخلہ اور دیگر وزارتوں کے ساتھ بات چیت چل رہی ہے۔ ہم مسئلے سے متعلق تمام وزارت کے ساتھ مفصل تبادلۂ خیال کررہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سچر کمیٹی کی سفارشات کو نافذ کرتے وقت اقلیتی فرقے کی سرگرم ساجھیداری کی ضرورت ہے۔ سلمان خورشید سے درج فہرست ذات کی طرز پر دلت عیسائیوں اور دلت مسلمانوں کے لیے تحفظ کے پیچیدہ مسئلے پر ان کی وزارت کی پالیسی کے بارے میں پوچھا گیا تو ان کا جواب تھا کہ ان کی وزارت ضرور اس مسئلے پر غور کرے گی۔ انھوں نے اسے حساس ایشو بتاتے ہوئے کہا کہ سماج کے تمام طبقوں کو ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ریزرویشن کے مسئلے پر کچھ آئینی رکاوٹیں ہوسکتی ہیں لیکن سپریم کورٹ کے کچھ حالیہ فیصلوں سے حکومت کو مدد مل سکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یو پی اے حکومت اور کانگریس پارٹی اقلیتوں کی جانب توجہ مرکوز کرنے کے لیے پابند عہد ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے، سچر کمیٹی کی سفارشات ایک بڑا قدم ہے۔ اس وقت انھیں نافذ کرنا اولین ترجیح ہے۔ جناب خورشید نے کہا کہ ایکویل اپورچیونٹی کمیشن (ای او سی) بھی ایک حوصلہ افزا قدم ہے، اس میں ہمارے لیے زبردست مواقع ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

گوپی چند نارنگ اور اے آر رحمان ڈی لٹ کے اعزاز سے سرفراز

● علی گڑھ۔ 8 جون، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے اپنے انسٹھویں تاریخی کنووکیشن کے موقع پر اردو کے عالمی شہرت یافتہ نقاد، دانشور اور ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ اور آسکر ایوارڈ یافتہ ممتاز موسیقار اے. آر. رحمان کو ان کی قابلِ تحسین اور گراں قدر خدمات کے اعتراف میں ڈی لٹ (Honoris Causa) کے اعلیٰ اعزاز سے سرفراز کیا۔

اس موقع پر پروفیسر نارنگ نے اے. ایم. یو. کے ارباب حل و عقد اور وائس چانسلر ڈاکٹر پی کے عبدالعزیز کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی فقط ایک ادارہ یا ایک یونیورسٹی ہی نہیں بلکہ اردو ادب کی تاریخ کا ایک درخشاں باب اور سرسید احمد خاں کے خوابوں کی روشن تعبیر بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس یونیورسٹی نے اقبال، عبدالحق، پنڈت نہرو، مولانا آزاد، راجندر پرساد، ذاکر حسین، ہمایوں کبیر، رادھا کرشنن، تاراچند، عبدالسلام، سروجنی نائیڈو، جگر مرادآبادی، عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی، علی سردار جعفری، کیسی کیسی جید، ہستیوں کو اعزاز کے لیے نشان زد کیا ہے، میری تو بساط کیا، البتہ جس زبان کا میں ایک ادنیٰ خدمت گزار ہوں وہ ہندوستان ہی نہیں پورے جنوبی ایشیا کی بڑی زبان ہے۔ اور اس کی خدمت میرے لیے ایسا سرمایۂ سعادت ہے جس پر میں جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اعزاز میرے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ انھوں نے اس موقع پر زور دے کر کہا کہ اردو کو فقط ایک زبان سمجھنا اور اس کو آٹھویں شیڈول کی درجہ بندی تک محدود رکھنا اردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے۔ اردو میرے نزدیک ایک زبان ہی نہیں، ایک اسلوبِ زیست، ایک اندازِ نظر، جینے کا ایک طریقہ وسلیقہ بھی ہے۔ یہ ہماری ایک ہزار برس کی ملی جلی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس نے ہمیں گھڑا بنایا اور سنوارا ہے، اور ہمیں وہ پہچان دی ہے جو آج ہمارا نشانِ امتیاز ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے خطاب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو مدینۃ العلم قرار دیا۔

اس موقع پر اے. آر. رحمان نے کہا کہ یہ میرے لیے باعث افتخار بات ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مجھے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ میری زندگی میں علی گڑھ کا یہ اعزاز ہمیشہ یادگار رہے گا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر پی. کے. عبدالعزیز نے اعزاز یافتگان پروفیسر گوپی چند نارنگ اور اے. آر. رحمان کی گراں قدر خدمات کو سراہا اور تمام مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

تقریب کی صدارت یونیورسٹی کے چانسلر جسٹس اے ایم احمدی نے فرمائی اور مغربی بنگال کے گورنر شری گوپال گاندھی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے سربراہان، ڈین صاحبان، سینئر پروفیسر، طلبہ و طالبات کے ساتھ علی گڑھ اور بیرون علی گڑھ کی متعدد ادبی، علمی، سماجی و سیاسی سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔

ادیبوں کا اظہار مسرت

● نئی دہلی۔ 9 جون، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی جانب سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ڈی لٹ کے اعلیٰ اعزاز سے نوازے جانے پر پوری اردو دنیا میں خوشی و انبساط کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مظہر امام نے کہا ہے کہ علی گڑھ

نے انھیں اس اعزاز سے نواز کر پوری اردو برادری کو سرشار کیا ہے۔ دراصل نارنگ صاحب کو جو اعزاز ملا ہے وہ پوری اردو دنیا کا اعزاز ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ نارنگ صاحب نے اے ایم یو کو مدینۃ العلم کہہ کر سب کا دل جیت لیا جبکہ وہ خود شہرِ علم اور خزانۂ علم ہیں۔ کمال احمد صدیقی نے کہا کہ بٹوارے کے بعد عام سیاست نے اردو کو تقسیم سے جوڑنا چاہا لیکن پروفیسر نارنگ نے اس کو تقسیم نہیں ہونے دیا اور اردو کو ہمیشہ ایک مشترکہ تہذیبی ورثے کے طور پر پیش کیا۔ وہ اس اعزاز کے واقعی مستحق ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بھی نارنگ صاحب کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری سے نواز چکی ہے اور اب علی گڑھ نے یہ اعزاز گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار نارنگ صاحب کو دے کر اپنی ایک بڑی ذمے داری نبھانے کا ثبوت دیا ہے۔

پروفیسر شہریار نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی نے نارنگ صاحب کو اپنا سب سے بڑا اعزاز دے کر اعزاز کی قدر و منزلت کو بحال رکھا ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ہمارے زمانے میں نارنگ صاحب اردو زبان و ادب کی سب سے قدر آور شخصیت ہیں۔ علی گڑھ نے انھیں یہ اعزازی ڈگری دے کر علیگ برادری میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر صادق نے کہا کہ نارنگ صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا جانا اہلِ اردو کے لیے نہایت فخر و مسرت کی بات ہے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دے کر نہ صرف نارنگ صاحب کو نوازا ہے بلکہ اپنی ڈگری کے وقار میں بھی اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ خوشی کی بات ہے کہ اعزاز سے سرفراز کیے جانے کے موقعے پر پروفیسر نارنگ نے صرف روایتی کلمات تشکر ہی نہیں کہے بلکہ اردو اور نئی فکر کے حوالے سے بہت پتے کی باتیں بھی کہیں۔ چندر بھان خیال نے کہا کہ علی گڑھ نے نارنگ صاحب کو جو اعزاز بخشا ہے اس پر ہم اردو والے جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ مخمور سعیدی نے کہا کہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے نارنگ صاحب عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ اے ایم یو جیسے قدیم اور عظیم ادارے کی جانب سے قدر افزائی نارنگ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک اور اعتراف ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کی خدمات ہمارے لیے قابلِ فخر ہیں۔ پروفیسر زاہد نے کہا کہ علی گڑھ کا یہ غیر معمولی اعزاز نارنگ صاحب کو بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا۔ شمیم طارق نے کہا کہ نارنگ صاحب کو ڈی لٹ کا اعزاز دیا جانا، حق بہ حق دار رسید، کے مصداق ہیں علاوہ ازیں دوسرے اہلِ ادب نے بھی نارنگ صاحب کو دلی مبارکباد پیش کی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ہندوستانی تہذیب کی بقا کے لیے اردو کو زندہ رکھنا ہوگا:

چندر بھان خیال

● بھوپال۔ 15 جون، ہندوستان کو زندہ رکھنا ہے تو اردو کو زندہ کرنا اور رکھنا ہوگا اور اردو کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا سیکولر کردار زندہ رکھا جائے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے چیئرمین چندر بھان خیال نے اپنے خطبۂ اعزازی میں کیا۔ چندر بھان خیال نے آج تقریب اعزاز، سیمینار اور مشاعرے کے دو روزہ پروگرام کے اختتامی خطاب میں کہا کہ ہمارے نظریات الگ ہوسکتے ہیں، ہمارے مسالک و مذاہب الگ ہوسکتے ہیں لیکن چونکہ ہم اردو کی محبت کے جذبے میں مشترک مشن لے کر چل رہے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے دلوں میں گنجائش رکھتے ہوئے اور باہمی نظریات اور مسلکی اختلافات کے باوجود متحدہ طور پر اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے اور اردو کی زندگی و بقا کے لیے کی جانے والی کوششوں کو کامیابی کی منزل تک پہنچائیں۔ سفر بہت مشکل اور صبر آزما ہے لیکن اردو کے جیالوں سے مجھے امید ہے کہ وہ اردو کو ہندوستان میں اس کا حق دلانے کے لیے یہ کر دکھائیں گے اور ایک دن ہندوستان میں اردو بھی اتنی ہی محبوب و مقبول ہوگی جتنی کہ آج دوسری زبانیں ہیں۔

سیمینار اور تقریب اعزاز کی مسند صدارت سے اظہار خیال کرتے ہوئے سینئر کانگریسی لیڈر عزیز قریشی نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اردو والے اپنا حق لینے کے لیے ملک کی تمام حکمراں اور غیر حکمراں سیاسی پارٹیوں سے صاف طور پر یہ کہہ دیں کہ ''جو ہمارا نہیں ہم اس کے نہیں'' اب ہم اردو والے بلاتفریق مذہب و ملت اس کو ہی ووٹ کریں گے جو اردو کی بقا اور اس کے تحفظ کے مشن میں ہمارا عملی ساتھ دے گا۔ انھوں نے کہا کہ 1947 کے بعد سے اب تک نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا کہ اردو زبان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں اور کوئی نہیں جو اس کی آنکھوں سے بہنے والے یہ آنسو پونچھے۔ پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان بنایا جانا اردو کے حق میں مضر ثابت ہوا۔ اردو دشمنوں کو ایک نیا بہانہ ہاتھ لگ گیا، اس کو مسلمانوں کی زبان ثابت کرنے کا، جبکہ ہندوستان اردو کا مولد و مسکن ہے اور اس کے بولنے، لکھنے اور ادب تخلیق کرنے والوں میں تمام اقوام اور خاص طور سے ہندو اور مسلمانوں کا برابر کا حصہ ہے اور یقیناً برابر کا حق بھی۔

14 اور 15 جون کو مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ''ملا رموزی سنسکرتی ہال'' میں منعقد سیمینار میں اسکولی تعلیم میں ''اردو کی بقا'' کے موضوع پر ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں، عارف عزیز، ڈاکٹر محمد نعمان خاں، ایوب واقف، پروفیسر

آفاق احمد، پروفیسر عتیق اللہ، رضیہ حامد، مختار شمیم، شمیم طارق اور ابراہیم اشک نے اپنے مقالات پڑھے۔

تقریب اعزاز میں کاروان ادب کی تقریبات کمیٹی کی طرف سے جن ادبا و تخلیق کاروں کو اعزاز دیا گیا ان کے نام ہیں، پروفیسر چندر بھان خیال، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر آفاق احمد، بشیر بدر، شمیم طارق، رضیہ حامد، نعیم کوثر، ارجمند بانو افشاں، نصرت مہدی، اقبال مسعود، عارف عزیز، ایوب واقف، مختار شمیم۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

چندر بھان خیال اور ملک العزیز کے اعزاز میں جلسہ

● چنئی۔ میاسی اردو اکادمی، چنئی کے زیر اہتمام بمقام صدق آڈی ٹوریم، نیو کالج، چنئی، جلسۂ تہنیت کا انعقاد ہوا جس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نائب چیئرمین چندر بھان خیال اور قومی اردو کونسل کے ممبر نامزد ہونے پر کے. ملک العزیز کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسے کی صدارت نواب محمد عبدالعلی، ہز ہائی نس پرنس آف آرکاٹ اور نائب چیئرمین تملناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی نے کی۔ میاسی اردو اکادمی کے کنوینر اے محمد اشرف نے مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ اردو زبان کی ترقی کی ذمے داری اردو طبقے پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ آنے والی نسلوں کو اردو زبان سے روشناس کرائیں۔ نواب محمد عبدالعلی نے کہا کہ اردو کسی مخصوص طبقے یا مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ ہر ہندوستانی کی زبان ہے۔ یہی وہ واحد زبان ہے جو ملک کے ہر مذہب، اور ہر طبقے کے لوگوں کو جوڑتی ہے۔ انھوں نے چندر بھان خیال سے درخواست کی کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے تملناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی کو مالی اعداد فراہم کریں۔ مہمان اعزازی موسیٰ رضا آئی اے ایس، سابق چیف سکریٹری، جموں و کشمیر اور چیئرمین، سدرن انڈیا ایجوکیشنل اسوسی ایشن نے چندر بھان خیال کی تہہ دار شخصیت سے سامعین کو متعارف کرایا۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے بھی انھوں نے مفید مشورے دیے۔ انھوں نے چندر بھان خیال کی ایک نظم کے چند مخصوص بند سنا کر سامعین کو محظوظ بھی کیا۔ دوسرے مہمان اعزازی ایاز حسین کنڑی منیجر ای ٹی وی حیدر آباد نے ای ٹی وی پر نشر ہونے والے اردو پروگراموں کی تفصیل بتائی۔ کے ملک العزیز نے کہا کہ چندر بھان خیال ایک فعال شخصیت ہیں، اور قومی اردو کونسل ان کی قیادت میں نئی راہوں پر گامزن ہے۔ اردو انجمنیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر ایک تحریک کا آغاز کریں اور بچوں کی اردو تعلیم پر زور دیں تاکہ آنے والی نسلیں اردو سے فیضیاب ہو سکیں۔ چندر بھان خیال نے قومی اردو کونسل کے مختلف اسکیموں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ضرورت ہے کہ اردو کونسل کے زیادہ سے زیادہ سینٹر کھولے جائیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کے رسم الخط کی حفاظت کی جائے۔ انھوں نے بتایا کہ قومی اردو کونسل ہر سال نئی کتابوں کی اشاعت کرتی ہے۔ یہ کتابیں لائبریری کے لیے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ سامعین کے اصرار پر جناب چندر بھان خیال نے اپنی طویل نظم ''لولاک'' کے چند مخصوص بند پیش کیے اور داد و تحسین حاصل کی۔ اس اجلاس میں میاسی اردو اکادمی تملناڈو، اردو لٹریری ایسوسی ایشن اور اردو ڈپارٹمنٹ، نیو کالج کی جانب سے چندر بھان خیال اور کے ملک العزیز کی شال پوشی کی گئی، جلسے کی نظامت اشفاق الرحمٰن مظہر نے کی اور ڈاکٹر حیات باشاہ نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ (سالار، بنگلور)

ایوان غالب میں قائم چاند پوری پر دو روزہ سیمینار

● نئی دہلی۔ 30 مئی، قائم چاند پوری اٹھارھویں صدی کے غزل گو شعرا میں اگر بہت ممتاز نہیں تو منفرد ضرور ہیں جنھوں نے غزل کی صنف کی تمام کلاسیکی اقدار پر اپنے فن کی بنیاد رکھنے کے باوجود مضمون آفرینی اور خیال بندی کے ساتھ بڑی حد تک معنی آفرینی پر بھی خاصی توجہ صرف کی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ''قائم چاند پوری: معاصر میر و سودا'' کے موضوع پر ''ایوان غالب'' میں منعقد 2 روزہ سیمینار کے دوسرے دن کے دوسرے اجلاس میں اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر اسلم پرویز نے کی جبکہ وسیم راشد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''قائم چاند پوری اور کلاسیکل غزل کے آداب'' کے عنوان پر اپنا مقالہ پڑھا اور کہا کہ قائم نے مضامین کی تلاش اور اظہار کے اسالیب میں میر اور سودا دونوں کی خوشہ چینی کی ہے۔ ڈاکٹر رضا حیدر نے ''قائم چاند پوری ایک منفرد شاعر'' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ قائم چاند پوری نے غزل میں اپنے کمال کا مظاہرہ کیا اور اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی کے لیے ہر موضوع کو نہایت سلیقے اور نفاست سے بیان کیا۔ ان کا دور میر و سودا کا دور تھا اسی وجہ سے وہ اور ان کی شاعری بے توجہی کا شکار ہوئی۔ اس کے باوجود ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا مصحفی، میر حسن، قدرت اللہ قاسم اور محمد حسین آزاد نے بھی اعتراف کیا ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر خالد علوی، پروفیسر فاطمہ بیگم اور ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ آج کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی اور ڈاکٹر خلیق انجم نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر شمیم حنفی نے ''اٹھارھویں صدی کی غزل اور قائم چاند پوری'' کے موضوع پر مقالہ پیش

کرتے ہوئے قائم چاند پوری اور ان کے عہد کی غزل کے تعلق سے تبصرہ کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر وسیم بیگم اور پروفیسر نسیم احمد نے مقالے پیش کیے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی اور پروفیسر صادق نے کی۔ نظامت کے فرائض اشفاق عارفی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر ریحانہ خاتون، ڈاکٹر ارجمند آرا، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر شافع قدوائی اور پروفیسر حنیف نقوی نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر فاطمہ بیگم اور پروفیسر عراق رضا زیدی نے اور نظامت ڈاکٹر شعیب رضا وارثی نے کی۔ نائلہ بیگم، ڈاکٹر ساحل احمد، ڈاکٹر مشتاق تجاوری اور ڈاکٹر شمس بدایونی نے اپنے مقالے پڑھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کی ترویج وترقی کے لیے ممکنہ اقدامات

● حیدرآباد۔ 29 مئی، سید محمد احمد اللہ وزیر اقلیتی بہبود آندھرا، نے کہا ہے کہ وہ اردو کی ترویج وترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور حالات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ٹھوس اقدامات کریں گے۔ وہ آج سہ پہر دفتر اردو اکادمی آندھرا پردیش میں اکادمی کے عہدیداروں اور ارکان سے خطاب کررہے تھے۔ آج حج کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے بعد اردو اکادمی کے دفتر پہنچے جہاں نائب صدر اردو اکادمی ایس کے افضل الدین اور دیگر ارکان نے ان کا خیرمقدم کیا۔ نائب صدر کے چیمبر میں ایک اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ چیف منسٹر ڈاکٹر وائی ایس راج شیکھر ریڈی کو اقلیتوں خصوصاً اردو زبان کی ترقی سے گہری دلچسپی ہے۔ ایس کے افضل الدین نے احمد اللہ کو مبارکباد دیتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ ان کے دور میں اردو کی ترقی کے لیے مثالی اقدامات کیے جائیں گے۔ اردو کے بجٹ کو 3 کروڑ روپے سے بڑھا کر 50 کروڑ کر دیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ چیف منسٹر کو اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی سے بے حد دلچسپی ہے اور اس سمت انھوں نے بے شمار ٹھوس اقدامات کیے ہیں جو ان کی دلچسپی کا بین ثبوت ہے۔ ریاست میں اقلیتوں کی ترقی اور خوشحالی کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ کسی بھی ریاست میں نہیں کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اقلیتیں بھی چیف منسٹر کو بہت پسند کرتی ہیں اور اسی لیے تمام اقلیتوں نے کانگریس کو اقتدار سے ہم کنار کیا ہے اور اب بھی وہ بہت کچھ کریں گے۔ اس موقعے پر صدر نشین وقف بورڈ الیاس سیٹھ، ایم ڈی فینانس کارپوریشن، سید الیاس رضوی، ڈائرکٹر اردو اکادمی محمد فائق احمد، محمد عمر اردو اکادمی کے ارکان ڈاکٹر ایم اے انصاری، عبدالمنیر، حاجی محمد موسیٰ قاسم کے علاوہ محمد عارف قریشی، محمد جہانگیر، سید میر حسین، سید یوسف خوندمیری، ضیاء الدین، یٰسین افسر، خواجہ رحیم الدین، جابر پٹیل، خواجہ ذاکر الدین، جاوید عبدالقادر، شاہد پیران، محمد عارف الدین، سید ہاشم علوی اور دیگر افراد موجود تھے۔ (منصف، حیدرآباد)

کرناٹک اردو اکادمی کا مشاورتی اجلاس

● بنگلور۔ 19 مئی، کرناٹک اردو اکادمی نے 18 مئی کو بنگلور میں کرناٹک کے اقلیتی تعلیمی اداروں کے ذمے داروں کا ایک مشاورتی اجلاس طلب کیا۔ اس مشاورتی اجلاس میں حاضر تعلیمی اداروں و اقلیتی فلاحی اداروں کے ذمے داروں نے دن بھر کے مباحث کے بعد چار الگ الگ گروپوں میں جو تجاویز اکادمی کے آگے اردو زبان و ادب کی ترقی و بقا کے سلسلے میں پیش کی تھیں، انھیں اکادمی کی جانب سے قبول کرتے ہوئے کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین جناب خلیل مامون نے بتایا کہ اس اجلاس میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں، ان تجاویز کو ایک میمورنڈم کی شکل میں وہ وزیراعلیٰ ایڈی یورپا کے آگے پیش کریں گے اور ان سے درخواست کریں گے کہ ان تجاویز کو آپ مجلس لیٹرس کی تعلیمی ترقی کمیٹی کے حوالے کریں اور اس پر عمل کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے حکومت کے متعلقہ محکموں کو ہدایت دیں، اس قرارداد کی نقل محکمہ تعلیم، وزیر تعلیم کے علاوہ گورنر اور دیگر حکام کو بھی روانہ کی جائے گی۔ کرناٹک کے سرکاری اور پرائیویٹ اقلیتی تعلیمی اداروں میں روزافزوں اردو کی خستہ حالت کو دیکھتے ہوئے غیر سرکاری اقلیتی اداروں کی جانب سے چلائے جانے والے پرائمری اور ہائی اسکولوں اور کالج چلانے والے اداروں کے ذمے داروں کو اردو اکادمی نے مباحثے کے لیے طلب کیا تھا اور ان سے درخواست کی گئی تھی کہ ان تعلیمی اداروں میں اردو کو زندہ رکھنے اور اردو تعلیم کو جاری رکھنے میں کیا کیا دشواریاں پیش آرہی ہیں اور حکومت یا اکادمی اس سلسلے میں کیا مدد کرسکتی ہے۔ آخر میں چار گروپوں میں منقسم ان اداروں نے حسب ذیل تجاویز پیش کیں:

اقلیتی تعلیمی اداروں میں اخلاقیات او ردینیات کو نصاب میں شامل کرکے اردو کو زندہ رکھا جائے، غیر سرکاری امدادی اردو میڈیم اسکولوں کی تمام خالی اسامیاں جلد سے جلد بھرتی کرنے کی حکومت سے اپیل کی جائے، مسلم انتظامیہ کے تحت چلائے جانے والے پرائیویٹ کانونٹ اسکولوں میں پانچویں تا دسویں جماعت تک ''اردو'' کو نصاب میں لازمی طور پر تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھانے کی اجازت حاصل کی جائے، تمام سرکاری کنڑا میڈیم اسکولوں میں بھی اردو کو تیسری زبان کے طور پر پڑھانے کی اپیل کی جائے، محکمۂ تعلیمات کی جانب سے یہ سرکولر جاری کروایا جائے کہ ایس ایس ایل سی امتحان میں بھی اردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھنے کی اجازت دی جائے، ڈی اے سی آرٹی میں تیسری جماعت سے اوپر کی تمام جماعتوں کی اردو

نصابی کتابوں کی اشاعت کی جائے، حکومت کی جانب سے جا بجا اردو اسکولوں کے اساتذہ کے لیے ورکشاپ منعقد کیے جائیں، ہر اردو سرکاری و غیر سرکاری اسکول میں اردو لائبریری قائم کی جائے اور وہاں کے لیے اکادمی سے اور دوسرے سرکاری اداروں سے اردو کتابیں مہیا کی جائیں، سرکاری و غیر سرکاری اردو اسکولوں میں اساتذہ کے جا بجا تبادلوں پر روک لگائی جائے، شہری علاقوں میں جھونپڑپٹی علاقوں سے اردو اسکولوں تک بچوں کو لانے کے لیے حکومت کی جانب سے ٹرانسپورٹ کی مفت سہولت فراہم کی جائے، ہائی اسکولوں میں اردو سبجیکٹ انسپکٹروں کا تقرر ہو، پرائمری پہلی تا پی یو سی و ڈگری تک کی اردو نصابی کتابوں کی اشاعت حکومت اور محکمۂ تعلیمات فوری کروائے۔

سنٹرل کالج کے سینٹ ہال میں منعقد اس مشاورتی اجلاس کے دوران آئی بی ایم ایجوکیشن سوسائٹی کے اقبال احمد نے یہ تجویز پیش کی کہ اردو کی ترقی کے لیے تمام غیر سرکاری اقلیتی اداروں کی جانب سے چلائے جانے والے انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔ اس سلسلے میں والدین کو بھی مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کم سے کم تیسری زبان کی حیثیت سے ضرور پڑھائیں۔ (سالار، بنگلور)

دربھنگہ میں اردو کتاب میلہ

● دربھنگہ۔ 3 جون، نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کی جانب سے شہر کے قلب میں واقع متھلا نچل یونیورسٹی کے قریب راج میدان میں ''دربھنگہ کتب میلہ'' کا انعقاد کیا گیا، جو 7 جون تک جاری رہا۔ میلہ کے اوقات دوپہر دو بجے سے شب کے نو بجے تک مقرر کیے گئے تھے۔ اس میلہ میں اہل اردو کے لیے ایک خوش کن بات یہ رہی کہ اس میں پہلی مرتبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اردو کی کتابیں بھی دستیاب کرائی گئی تھیں۔ وہیں انجمن ترقی اردو اور اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے لگائے گئے اردو کتابوں کے کاؤنٹر بھی اردو طبقہ کے لیے توجہ کے مرکز رہے۔ اس میلے میں ساہتیہ اکادمی، دہلی پرکاشن، راج ودیا کیندر، میتھلی اکادمی سمیت متعدد 32 پبلیکیشن کی کتابیں دو درجن سے زائد دکانوں پر دستیاب تھیں۔ کتابوں کے شائقین کی بھی تعداد اچھی خاصی دیکھی گئی۔ مذکورہ میلے کے احاطے میں مائنارٹی انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس کی جانب سے مفت طبی کیمپ کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں مریضوں کا مفت علاج ڈاکٹر قطب لدین کے ذریعے ادارہ کی سربراہ نجم السحر کی قیادت میں کیا گیا۔ ادبی انجمن ''بزم ادب'' دربھنگہ نے ایک اپیل جاری کرکے اردوداں طبقے سے اپیل کی کہ وہ میلے میں پہنچ کر اردو کی کتابیں ضرور خریدیں اور اپنی مادری زبان کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کریں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اکادمیوں کے انعامات میں تخفیف نامناسب

● نئی دہلی۔ 6 جون، دہلی کی تمام اکادمیوں کو سال میں صرف 5 ایوارڈ دینے کی ہدایت نوکر شاہی کا منمانا فیصلہ ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں کے بارے میں وہ لوگ فیصلے کر رہے ہیں جو آج تک اپنے گلے سے انگریزی کی غلامی کا طوق نہیں اتار سکے۔ ان خیالات کا اظہار معروف ماہر تعلیم، ادیب اور نقادوں نے روزانہ راشٹریہ سہارا سے بات چیت کے دوران کیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے اردو اکادمی کے ایوارڈوں کی تعداد کم کر کے 5 کر دیے جانے کے فیصلے کو افسوسناک اور ناقابل فہم قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ایوارڈوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تاکہ نوجوان لکھنے والوں کی بھی صحیح ڈھنگ سے حوصلہ افزائی ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ ایوارڈ دینے کے لیے زمرہ بندی ہونی چاہیے اور ایوارڈ حاصل کرنے کے لیے جو لابنگ سسٹم جاری ہے اسے ختم کیے جانے کی سخت ضرورت ہے۔ ایوراڈ کام اور صلاحیتوں کی بنیاد پر دیا جانا چاہیے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین اور سینئر صحافی و شاعر چندر بھان خیال نے کہا کہ اردو اکادمی دہلی تو پہلے ہی بہت کم ایوارڈ دیتی ہے، اس کے مقابلے ہندی اور دوسری اکادمیاں کہیں زیادہ ایوارڈ دیتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو اکادمی کے مختلف شعبوں میں جو بھی ایوارڈ ہیں وہ سب بہت اہم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سب کو مساوی رقم دینے کی بات تو درست ہے لیکن ایوارڈوں کی تعداد میں کٹوتی قطعی نامناسب ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ سرکار کا یہ فیصلہ اس بات کا غماز ہے کہ وہ اکادمیوں کو خود مختار نہیں بنانا چاہتی۔ کتنے ایوارڈ دینے ہیں اس کا فیصلہ حکومت کو نہیں بلکہ اکادمیوں کی گورننگ کونسل کو کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جہاں تک سب کو مساوی رقم دینے کی بات ہے تو نئے پرانے لکھنے والوں، کہنہ مشق ادیبوں اور شعرا کو ایک صف میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر اس فیصلے پر عمل ہوا تو اس سے نوجوان صلاحیتوں کی حوصلہ شکنی ہوگی۔ دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ وہ اس فیصلے کے قطعی حق میں نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہ فیصلہ ایسے وقت میں لیا جا رہا ہے جب اردو، ہندی، سنسکرت اور سندھی کسی بھی اکادمی کی گورننگ کونسل کام نہیں کر رہی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

عمیق حنفی یادگاری توسیعی خطبہ

● اجین۔ 2 مئی، شعبۂ اردو گورنمنٹ مادھو کالج اجین (ایم۔پی) کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے

پرنسپل مادھوکالج ڈاکٹر ایل این ورما کی صدارت میں عمیق حنفی یادگاری توسیعی خطبہ منعقد ہوا۔ سب سے پہلے عمیق حنفی کی تصویر پر گل پوشی کی گئی اور مہمان مقالہ نگار کا پھولوں سے استقبال کیا گیا۔ اس کے بعد صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر غلام حسین نے عمیق حنفی کی ادبی خدمات پر مختصراً روشنی ڈالی اور مہمان مقالہ نگار کا تعارف کرایا۔

دوسری بار منعقد ہونے والے اس یادگاری توسیعی خطبے کے لیے ممتاز و معروف ادیب اور ناقد پروفیسر صادق وسابق صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کو مدعو کیا گیا تھا۔ فاضل مقالہ نگار نے ''امیر خسرو: حیات و صفات'' موضوع پر بصیرت افروز مقالہ پیش کیا۔ اس میں موصوف نے ہندوستانی زبان وادب اور مذہب و ثقافت کے حوالے سے مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھانے میں امیر خسرو کے غیر معمولی کارناموں کا مؤثر اور مفصل جائزہ لیتے ہوئے انھیں مقناطیسی اور نابغۂ روزگار شخصیت قرار دیا نیز دورِ حاضر کے تناظر میں ان کے افکار وخیالات کی معنویت کو بڑے ہی سلیقے سے اجاگر کیا۔ اس موقع پر مہمان خصوصی پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) نے امیر خسرو اور عمیق حنفی کے متعلق پرتاثیر تقریر کی اور شعبۂ اردو کی کاوشوں کو سراہا، محترم پرنسپل صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس پروگرام کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا اور شعبۂ اردو کے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کی۔ اس یادگاری توسیعی خطبہ میں اردو اور ہندی کے شعرا و ادبا، عمائدین شہر، کالج کے پروفیسر حضرات، طلبہ و طالبات کالج کے تاریخی گاندھی ہال میں کثیر تعداد میں شریک ہوکر ادبی محفل کو پروقار بنایا۔ شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر ظفر محمود نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اظہار تشکر ڈاکٹر نصرت سلطانہ نے کی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون کی اظہار ممنونیت کی۔ (ڈاک سے)

اردو تحقیق پر علمی مذاکرہ

● دربھنگہ۔ 14 مئی، شعبۂ اردو ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں ''یونیورسٹی میں اردو تحقیق کی موجودہ صورت حال'' پر ایک علمی مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت صدر شعبۂ اردو پروفیسر ظفر حبیب نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ صدر شعبۂ اردو و ملت کالج دربھنگہ نے انجام دیے۔ اس علمی مذاکرے میں ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے زیراہتمام تمام کالجوں کے اردو اساتذہ نے شرکت کی۔ ان کے علاوہ ریسرچ اسکالرس، ایم اے کے طلبہ وطالبات موجود تھے۔

مذاکرے کا آغاز پروفیسر رئیس انور رحمان سابق صدر شعبۂ اردو کے کلیدی خطبے سے ہوا۔ اپنے خطبے میں پروفیسر رحمان نے تحقیق کی مبادیات اور اس کے اصول پر دانش ورانہ گفتگو کی اور تحقیق کے معیار کی گرتی ہوئی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا اور نگراں حضرات کو یہ مشورہ دیا کہ وہ تحقیق کے معیار و انداز کو بہتر بنانے کی سنجیدہ کوشش کریں۔ ڈاکٹر جمال اویسی نے تحقیق کے دوران پیش آنے والی دشواریوں کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر خالد سجاد نے اس بات پر زور دیا کہ ان مقامی دانش وروں اور فن کاروں کو تحقیق کا موضوع بنایا جانا چاہیے جو اب تک پردہ فضا میں ہیں۔ مدھوبنی سے آئے ہوئے پروفیسر بدیع الزماں نے تدریسی مسائل پر زور دیا۔ ڈاکٹر آفتاب اشرف نے نگراں حضرات سے گزارش کی کہ وہ ریسرچ اسکالر کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتے رہیں اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کریں۔ محمد بدرالدین، شعبۂ اردو ناگندر جھا مہیلا کالج، دربھنگہ نے تدریس کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے حل کے لیے عملی اور مؤثر تجاویز پیش کیے ساتھ ہی یونیورسٹی سطح پر ریسرچ اسکالرس کو دوران تحقیق درپیش مسائل اور ان کے سدباب کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر حافظ محمد انیس صدری نے تحقیق کے معیار کے گرنے کا سبب ملازمتی اور منصبی ضرورتوں اور اس کی ترقی کو بتایا جب کہ ڈاکٹر قیام نیر نے یونیورسٹی کی تعلیم میں گراوٹ کے سدِ باب کے لیے اجتماعی کوششوں کی ضرورت پر زور دیا۔ جناب سجاد خاں ریسرچ اسکالر نے ایم اے کے نصاب میں ڈزرٹیشن کو رائج کرنے پر زور دیا تاکہ طلبہ تحقیق کے اصول ومبادیات سے واقف ہوسکیں۔ سمستی پور کے پروفیسر سیف اللہ عزمی نے اچھی تحقیق وتنقید کے لیے معیاری لائبریری کی ضرورت پر زور دیا۔

دوران نظامت ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ نے اس علمی مذاکرے میں اساتذہ حضرات کو اس بات کی طرف توجہ متوجہ کیا کہ تحقیق میں جانے کا پہلا قدم تخلیق ہوتا ہے جس کی طرف طلبہ کو شروع کے درجات سے ہی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ آنرس اور ایم اے کے درجات میں طلبہ کو اس طرح تیار کیا جائے کہ ان کے لیے تحقیق کا راستہ آسان ہوجائے۔ ڈاکٹر محمد ارشد جمیل نے اپنی گفتگو میں اس بات پر زور دیا کہ نگراں حضرات مقالہ کی پیش رفت اور اس کے معیار و اقدار پر گہری نظر رکھیں تاکہ مقالہ زیادہ سے زیادہ وقیع اور معیاری ہوسکے۔

آخر میں صدر جلسہ پروفیسر ظفر حبیب نے اپنی صدارتی گفتگو میں تمام مباحث کا ماحصل پیش کرتے ہوئے چند مفید مشورے دیے۔ انھوں نے کہا کہ ریسرچ کاروبار بن چکا ہے۔ اسے حصول علم اور فروغ علم کا درجہ عطا کرتے ہوئے، اس کی توسیع کو عبادت کا درجہ دے کر دیگر علوم سے استفادہ کرتے ہوئے اردو زبان کی عظمت کو بحال کرنے کا شوق اور حوصلہ پیدا کیا جائے۔ اب بھی نئے جہان پردۂ فضا میں ہیں، انھیں منظرعام پر لانے کی ضرورت

ہے۔ اس مذاکرے کے دیگر شرکا میں ڈاکٹر محمد قیس، ڈاکٹر منصور عمر، جناب منظر افلاک، ڈاکٹر محمد قاسم، پروفیسر بدرالدین، ڈاکٹر عبدالقیوم وغیرہ حضرات تھے۔

(ڈاک سے)

اعزاز و اکرام

● تمل ناڈو۔ 26اپریل، اردو اکادمی، تمل ناڈو کے زیر اہتمام 26اپریل 2009 بروز اتوار شام کے سات بجے بمقام مرینا کیمپس، پلاٹینم جوبلی آڈیٹوریم، مدراس یونیورسٹی میں چوتھا سالانہ ایوارڈ کنووکیشن منعقد ہوا۔

جناب ایس کے ڈوگرا، آئی. پی. ایس.، ڈائرکٹر جنرل آف پولیس، تملناڈو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک تھے۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین، پروفیسر و چیئر مین، شعبۂ اردو، مدراس یونیورسٹی، مہمانِ اعزازی نے افتتاحی کلمات پیش کیے۔

اکادمی کے چیئر مین ڈاکٹر ظہیر آفاق نے استقبالیہ پیش کیا۔ جناب اصغر ویلوری مہمانِ اعزازی مسند نشیں تھے۔ جلسہ میں ہمیشہ کی طرح اردو اور دیگر اقلیتی زبانوں کے دانشوروں، شاعروں، ادیبوں، اساتذہ اور قومی یکجہتی کے سربراہوں کو اعزازی ایوارڈ دیے گئے۔ مقامی لوگوں کے علاوہ دوسرے صوبوں کے بھی انشا پرداز حضرات و خواتین شرکت فرما تھے، جن میں کیرالہ سے جناب کے پی شمس الدین تردکاڈو، (اردو)، حیدرآباد سے جناب شیخ قادر حسین، کالیکٹ سے ڈاکٹر وی جے پرشاد (ملیالم)، ممبئی سے ڈاکٹر حمید عبدالعزیز غازی (مراٹھی)، ونڈلور سے ڈاکٹر سید محمد ابراہیم (اردو) قابل ذکر ہیں جنھیں اعزازات سے نوازا گیا۔

"انجمنِ حمایتِ اردو" کے صدر ڈاکٹر سید محمد ابراہیم نے ڈاکٹر ظہیر آفاق کو ان کی پچاس سالہ اردو خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر حکیم میر طفیل احمد ایوارڈ سے نوازا۔

اس جلسے میں قومی یکجہتی کا احترام کرتے ہوئے دیگر زبانوں کی عظمتوں کا اعتراف کیا گیا۔ اردو ہی ایک ایسی واحد زبان ہے جو دیگر زبانوں کو گلے لگاتی ہے۔ اس انفرادی شانِ نیازی پر مہمان خصوصی جناب ڈوگرا صاحب (ڈی. جی. پی) نے اپنے دلنواز کلمات پیش کیے۔ جلسے کے اختتام پر ڈاکٹر سید محمد ابراہیم نے شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

● آسنسول۔ 12 مئی، آسنسول میں ادارہ "بزم اردو" کی جانب سے دوسرے سالانہ کل ہند مشاعرے کے موقعے پر صحافت، تدریس اور شعر و ادب کے لیے تین ایوارڈ تقسیم کیے گئے ان ایوارڈ کو آسنسول کے بزرگ صحافی قیام انیس، مدرس و ادیب ڈاکٹر عابد ضمیر اور شاعر اور یس صدر کے نام سے منسوب کیا گیا۔ "بزم اردو" کے صدر نواب خان، چیئر مین ارشد علی، سکریٹری علی عمران رانا اور کنوینر قیصر امام و مشیر کار سید جلال احمد کاکوی وغیرہ نے ایوارڈ کے لیے غور و خوص کے بعد تین لوگوں کا انتخاب کیا جو حسب ذیل ہیں:

قیام انیس میموریل ایوارڈ برائے اردو صحافت، جواں سال صحافی وجیہ الدین جمال کو دیا گیا، ڈاکٹر عابد ضمیر میموریل ایوارڈ برائے تدریس، رانی گنج کالج کے سابق صدر شعبۂ اردو مشتاق احمد کو دیا گیا اور اور یس صدر میموریل ایوارڈ برائے شعر و ادب، بزرگ شاعر محبوب انور کو دیا گیا۔

بطور اعزاز 3100 روپئے نقد، سند، شال اور ایک مومینٹو ڈاکٹر شہناز نبی صدر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی و چیئر مین مغربی بنگال اردو اکادمی کے ہاتھوں دیا گیا۔ اس موقع پر سہراب علی، الحاج قمرالدین، ایس ایم جلال اور کل ہند مشاعرہ کے شریک شعرا موجود تھے۔ صدر مشاعرہ سید جلال احمد کاکوی نے تینوں مرحومین کو خراج عقیدت پیش کی اور ان کی کارکردگی کی ستائش کی۔ اس کے علاوہ وجیہ الدین جمال، مشتاق احمد اور محبوب انور کی کارکردگی پر اظہار خیال کیا، جس کے لیے ان لوگوں کو ایوارڈ دیے گئے۔ آسنسول" بزم اردو" کی جانب سے دوسرے کل ہند مشاعرے کی صدارت سید جلال احمد کاکوی نے کی، جس میں ملک کے نمائندہ شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

(ڈاک سے)

● میوات۔ 15 مئی، ہریانہ ایجوکیشن بورڈ کے سالانہ امتحان میں الفلاح ماڈل اسکول بھادس (میوات) کے طلبہ و طالبات کی طرف سے بہتر پوزیشن حاصل کرنے پر طلبہ و طالبات اور اساتذۂ کرام کی حوصلہ افزائی کے لیے بھارت سیوا ٹرسٹ نے شیروانی ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ الفلاح ماڈل اسکول کے منیجر قاری سراج الدین نے بتایا کہ بھارت سیوا ٹرسٹ کے سکریٹری جناب احمد رشید شیروانی نے اسکول کے دسویں کلاس کے طلبہ و طالبات — شمیم احمد 1000، اکمل کمار سینی، 800، کمل 600، صائمہ بانو 400، راشد حسین 200، اور نویں کلاس کے محمد جنید 500، عادل خان 400، انیس احمد 300، جاوید خان 200، محمد منفید 100 اور محمد اسلم 100، اور آٹھویں کلاس کے عتیق الرحمٰن 400، وارث خان 300، افسانہ بانو 200، محمد رضوان 100 کو نقد انعام دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی ہے، نیز اسکول کے اساتذۂ کرام اور ہیڈ ماسٹر 2500، اقبال محمد 700، محمود خان 700، محمد یوسف سیفی 500، افتخار شمسی 500، محمد جمشید سلفی 500 دے کر اساتذہ کی محنت کے لیے ان کو مبارکباد کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی کی ہے۔ بھارت سیوا ٹرسٹ کے سکریٹری احمد رشید شیروانی نے اپنے تحریری بیان میں لکھا کہ الفلاح ماڈل اسکول بھادس کے طلبہ و طالبات اور اساتذۂ کرام نے 2009 کے بورڈ کے سالانہ امتحان میں اپنی محنت کا مظاہرہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اسکول اور بچوں و اساتذہ

کرام کو انعامات کے ساتھ ساتھ مبارکباد بھی پیش کی اور مستقبل میں مزید محنت کرنے کی اپیل کی۔ (ڈاک سے)

● پونہ۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل ادبی رسالے "اسباق" پونہ کے مدیر نذیر فتح پوری کو ان کی خدمات کے اعتراف میں امریکہ کی ایک یونیورسٹی نے حال ہی میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی اعزازی سند تفویض کی ہے۔ اس اعزاز کی حصولیابی پر ادارہ اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر نذیر فتح پوری کے اعزاز میں ایک شاندار استقبالیہ تقریب کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں ملک اور بیرون ملک کے کئی نامور ارباب قلم کے علاوہ شہر پونہ کی علمی، ادبی، شخصیات شریک ہوئیں۔ صدارت محترم منور پیر بھائی نے فرمائی، جبکہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر ساحر شیوی، (مدیرِ پرواز، لندن)، شفیق موڈک (انڈونیشا) ڈاکٹر فراز حامدی (جے پور) ڈاکٹر محبوب راہی (اکولہ) عبدالاحد ساز، ڈاکٹر شیخ عبداللہ، ڈاکٹر مصطفےٰ پنجابی اور علی ایم شمسی (ممبئی) کے علاوہ عابد انعامدار، اور ممتاز پیر بھائی نے شرکت فرمائی۔

تلاوت کلام پاک کے بعد صدر محترم اور مہمانوں کا تعارف رفیق قاضی نے پیش کیا۔ ڈاکٹر ساحر شیوی، رفیق جعفر اور ڈاکٹر فراز حامدی کا تعارف ادھو مہاجن بسمل نے پیش کیا اور راقم الحروف نے نذیر فتح پوری کا تعارف اور ان کے حالات پر گفتگو کی، پونہ کی مختلف انجمنوں اور احباب کے ہاتھوں شالیں اور گلدستے پیش کر کے ان کے لیے اظہارِ عقیدت و محبت کا یہ سلسلہ تادیر چلتا رہا جن میں غزل اکادمی اور پر یاس اردو ہندی اکادمی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اختتام پر ڈاکٹر نذیر فتح پوری کے والد محترم حاجی ابراہیم خان جوڑ اور نذیر صاحب کی اہلیہ محترمہ کا ممتاز پیر بھائی نے استقبال کیا۔ ڈاکٹر نذیر فتح پوری نے اپنی تقریر میں سب سے پہلے اس اعزاز کو اپنی مرحومہ سے منسوب کیا اور کہا کہ میری ماں اردو کے الف سے بھی ناواقف تھی۔ لیکن وہ ابتدا ہی سے مجھے سودا سائر (مارواڑی میں فرماں بردار) کہتی تھی۔ یہی سائر دھیرے دھیرے شاعر بن گیا۔ انھوں نے اپنی والدہ محترمہ کی شفقتوں کا اور اپنی شریکِ حیات کے قدم بہ قدم تعاون کا تذکرہ، بچپن سے تا حال کیا۔

صدر جلسہ محترم منور پیر بھائی نے نذیر فتح پوری کے اس ایوارڈ کو اپنے شہر اور کیمپس کے لیے قابلِ فخر قرار دیا۔ محمد علی مقادم کے اظہارِ تشکر پر اس تاریخی جلسے کا اختتام ہوا۔ محترمہ ظلِ ہما بارگیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● الہ آباد۔ 2 جون، اردو کے آئینی حقوق کے لیے جدو جہد کرنے والی تنظیم اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے مرکزی وزیر فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل سے اپیل کی ہے کہ "صدر جمہوریہ کے حکم 1960 کی ہدایت نمبر-7 اور مرکزی حکومت کی "آفیشیل لینگویج پالیسی آرڈر 2-20A، کو ہندوستان کی 5 ریاستوں، آندھرا پردیش، جھارکھنڈ، اتر پردیش، دہلی و بہار میں نافذ کیا جائے۔ ان پانچوں ریاست کی حکومتوں نے اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرتے ہوئے اسے اپنے اپنے علاقے کی دوسری آفیشیل لینگویج کا حق دے دیا ہے، مگر مرکزی حکومت کا کوئی بھی محکمہ و خود مختار ادارہ اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حق اطلاعات قانون 2005 کے تحت مرکزی وزارت داخلہ کے محکمہ آفیشیل لینگویج سے جاری کیے گئے ایک خط مورخہ 24/04/2009 کی فوٹو کاپی یو این آئی اردو سروس کو مہیا کراتے ہوئے تنظیم نے کہا کہ مورخہ 26/03/2009 کو وزارت داخلہ نے ایک خط وزارت فروغ انسانی وسائل کو لکھ کر اپیل کی ہے کہ تنظیم کی درخواست مورخہ 21/09/2003 اور 31/09/07 میں لکھے گئے آئینی مطالبات پر غور کرتے ہوئے اس کا تصفیہ کیا جائے مگر بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مرکزی وزارت داخلہ کے پبلک انفارمیشن آفیسر چندر پرکاش نے تنظیم کے قومی آنریری جنرل سکریٹری ڈاکٹر پرواز علوم کو اطلاع دی ہے کہ وزارت فروغ انسانی وسائل کے ذریعے تنظیم کی دونوں درخواستوں پر ابھی تک کوئی کارروائی نہیں کی گئی ہے۔ تنظیم کے قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ مذکورہ دونوں درخواستوں میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ پانچ ریاستوں کے اردو داں عوام کے مفاد میں، صدر جمہوریہ کے حکم 1960 کے حکم نمبر 7 اور مرکزی حکومت کی "آفیشیل لینگویج پالیسی آرڈر 2-20A" پر عمل درآمد کرتے ہوئے تمام محکموں کے "فارم" علاقائی زبان دوسری سرکاری زبان "اردو" میں بھی شائع کیے جائیں اور مرکزی حکومت کے تمام دفاتر و نیشنلائز بینکوں میں ملازمین کی تقرری کے لیے دوسری سرکاری زبان "اردو" کا علم لازمی کیا جائے۔ انھوں نے مسٹر کپل سبل سے اپیل کی کہ اس صورت حال پر سنجیدگی سے توجہ دیں کیوں کہ وہ خود بھی ایک ماہر قانون ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● کشتواڑ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ کشتواڑ کی جانب سے بہ اشتراک کلچرل اکادمی ریاست جموں و کشمیر مورخہ 18 مارچ 2009 ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا، جس میں ریاست جموں و کشمیر کے نامور مصنف جناب بشیر احمد بشیر الدین نشاط کو انجمن ہذا کی جانب سے خدمت، تاریخی سند بعنوان "محسن اردو" اور ایک عدد شال سے بدست مہمانِ خصوصی جناب بھگت گلرو پیش کیا گیا۔ انجمن سالانہ کارکردگی کی مفصل روداد صدر انجمن جناب عشاق کشتواڑی نے پیش کی۔ جس میں وضاحت کی گئی کہ انجمن تحصیل کی سطح سے لے کر کل ہند مشاعروں اور ادبی سیمیناروں کا اکثر انعقاد کرتی رہی ہے۔ گذشتہ برس امر سنگھ کلب جموں میں انجمن کی جانب سے ایک کل ہند

مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں کئی نامور شعرا شریک ہوئے تھے۔

(ڈاک سے)

● بھوپال۔ 3 جون، مدھیہ پردیش اردو اکادمی اب اپنے ہی گھر میں کرایہ دار نہیں کیونکہ اب اس کو اس کے نام سے تعمیر کی گئی بلڈنگ کے مالکانہ حقوق دے دیے گئے ہیں۔ ابھی تک اردو اکادمی کی عالی شان بلڈنگ میں دوسری تہذیبی، ادبی اور ثقافتی یونٹوں کے بھی دفاتر تھے۔ اب اکادمی کو مالکانہ حقوق مل جانے سے ان تمام اکیڈمک اداروں کو کرایہ ادا کرنا ہوگا، جس سے کہ اردو اکادمی کو ایک لاکھ 75 ہزار کے قریب آمدنی ہوگی۔ اس سلسلے میں اکادمی نے بلڈنگ میں موجود تمام اداروں کے ذمے داروں سے بات چیت کرکے معاملات طے کر لیے ہیں۔

اکادمی کے ذرائع کے مطابق اردو اکادمی رواں مالی سال میں اپنی اکادمک سرگرمیوں کو رفتار دینے جا رہا ہے۔ نئے پروگرام میں صوبہ کے ہر ضلع کو نمائندگی دی جائے گی۔ اکادمی کے ذمے داروں نے حکومت کے پبلک ریلیشن کمشنر منوج شریواستو کا خصوصی شکریہ ادا کیا ہے کہ ان کی کوششوں سے اکادمی کو اپنے ہی گھر میں کرایہ ادا کرنے سے نجات ملی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 3 جون، دلشاد گارڈن بلاک کانگریس کمیٹی کے صدر طاہر حسین عرضی نے وزیر کابینہ جناب کپل سبل کے وزارت فروغ انسانی وسائل کا کام کاج سنبھالنے وسچر کمیٹی کی رپورٹ کو اولین ترجیح دینے اور اس پر سنجیدگی سے کام کرنے کے پختہ ارادے اور خواہش کا زوردار خیر مقدم کیا ہے۔ طاہر عرضی نے کہا کہ فروغ انسانی وسائل کے وزیر کی شکل میں ان کے کردار اور کوششوں کی بدولت سچر کمیٹی کی رپورٹ نافذ کرانے اور مسلم اقلیتوں کو تعلیم و روزگار جیسے جائز حقوق کے حصول کو یقینی رفتار ملے گی۔

انھوں نے مزید کہا کہ سبل صاحب ایک سلجھے ہوئے سیاسی رہنما ہیں جو سچر کمیٹی رپورٹ کو نافذ کرانے میں ایک اہم اور مثالی رول ادا کریں گے جس سے ملک کے سبھی طبقوں کو مضبوطی ملے اور ہمارا ملک بھی دنیا کے خوشحال ممالک میں شمار کیا جاسکے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 13 مئی، اردو اکادمی دہلی کی جانب سے لاکھوں روپے اردو خواندگی مراکز پر خرچ کیے جا رہے ہیں، کثیر تعداد میں لوگ اس سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں مگر اردو کے نام پر روزی روٹی حاصل کرنے والے ٹیچرز کا برا حال ہے۔ ذرائع کے مطابق اردو اکادمی ٹیچرس تقریباً 16-15 سال سے درسی خدمات انجام دے رہے ہیں مگر انھیں ابھی تک مستقل نہیں کیا گیا۔ سینٹرل گورنمنٹ کے لیٹر نمبر 1402/2/78 ESTT(O) سرکاری دفاتر کو برائے عمل درآمد ارسال کیا گیا تھا جس میں واضح کیا گیا تھا کہ ادیب، ماہر، کامل اور معلم میٹرک، انٹرمیڈیٹ، بی۔اے۔ کے مساوی ہیں۔ مگر روز اول سے ہی اردو معلم کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ جب کہ اردو معلم نے اردو اکادمی کے تحت اپنی زندگی کا نصف حصہ تعلیم و تدریس میں گزار دیا۔ باوجود اس کے وہ لوگ ابھی تک جزوی اور وقتی ٹیچرس ہیں۔ اس سلسلے میں سرسید ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر یوسف حسین انصاری نے وزیر اعلیٰ شیلا دکشت کو تمام دستاویز بھیج کر اپیل کی تھی مگر تسلی کے علاوہ کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

● سہارنپور۔ 22 مئی، اردو زبان کے فروغ اور اس کی ترقی کے لیے اردو داں طبقے کو مزید سرگرم ہوکر میدان میں آنا ہوگا۔ صرف حکومت کے سہارے اردو کی ترقی ممکن نہیں۔ ان خیالات کا اظہار اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقد پریس کانفرنس میں ایسوسی ایشن کے ضلع صدر راؤ عبدالستار نے کیا۔ انھوں نے بتایا کہ گذشتہ سال ان کی ایسوسی ایشن نے اردو کی ترقی کے لیے ایک عملی خاکہ تیار کیا تھا جس پر عمل کرکے ایسوسی ایشن نے اردو زبان کو گھر گھر پہنچانے میں اہم رول ادا کیا، انھوں نے بتایا کہ حکومت کی جانب سے مفت کتابیں فراہم کرا کر تقسیم کرائی گئیں۔ ابتدائی اردو سیکھنے کے لیے ایک قاعدے کی اشاعت کرا کر پورے ضلع میں دس ہزار کے قریب مفت تقسیم کرایا گیا، سالانہ اور ششماہی امتحانات میں اردو کے پرچوں کی اشاعت اردو کی جانب توجہ دلانے کے لیے مختلف سیمینار کا انعقاد اور پوسٹر بازی مہم اردو فہرست تعطیل کی پہلی مرتبہ اشاعت کی گئی۔ اردو مضمون میں نمایاں مقام حاصل کرنے والے ہونہار طلبہ و طالبات کو اعزازات سے نوازا گیا نیز پرائمری و جونیئر سطح پر اردو تعلیم حاصل کرنے والے غیر مسلم طلبہ و طالبات کو بھی انعامات سے نوازا گیا۔ اس موقع پر سید وجاہت شاہ کمل دیوبندی نے کہا مستقبل میں ایسوسی ایشن اپنے خدماتی دائرے کو وسعت دینا چاہتی ہے۔ امسال غریب مسلم طلبہ و طالبات کو مفت کاپیاں اور بیگ تقسیم کرنے کا پروگرام ہے اور ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے جو نمایاں کردار ادا کر رہی ہے اس کے لیے مختلف جماعتوں کی مدد بھی درکار ہے تاکہ ایسوسی ایشن کا فروغ ہو اور قافلہ راستے میں نہ ٹھہر جائے۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 21 مئی، شمع ایجوکیشنل اینڈ پولی ٹیکنیک سوسائٹی دہلی و جعفر آباد R.W.A. کی جانب سے فروغ اردو کے لیے ایک مذاکرے کا انعقاد جعفر آباد میں کیا گیا۔ دہلی سرکار کے اردو ڈپارٹمنٹ کے نوڈل افسر شریف الحسن نقوی نے کہا کہ آج اردو کو تقویت دینے کے لیے ہر خاص و عام کو اپنی جانب سے جدوجہد کرنی ہوگی۔ ہماری مادری زبان آج کمزور ہو رہی ہے۔ سرکار اسے

طاقت دینے کے لیے کوشش کررہی ہے مگر عام آدمی اس جانب توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ ہم .R.W.A کے کارکنان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اسکول و اداروں میں اردو کے تحفظ کے لیے تعاون دیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کے لیے تعاون دیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر دلی خوشی ہورہی ہے کہ آج کے اس جلسے میں 90 فیصدی تعداد نوجوانوں کی ہے، اس سے لگتا ہے کہ اردو کا مستقبل روشن ہے۔ کیوں کہ کسی بھی مہم کو کامیاب بنانے میں نوجوانوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ اردو ادب میگزین کے مدیر ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ زبان انسان کی شردعاتی زندگی میں سب سے اہم ہوتی ہے۔ ہمارے پاس مادری زبان کے تعلیمی ادارے ہونے چاہئیں جہاں پر اردو کی بہترین تعلیم دی جاسکے کیوں کہ جو مادری زبان ہوتی ہے تو اس کے ذریعے بولنا، پڑھنا، لکھنا آسان ہوجاتا ہے اور پھر آگے چل کر اس طالب علم کو اور بڑی ڈگریاں حاصل کرنے میں وہی مادری زبان یعنی اردو اس کی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو پڑھانے کے ادارے اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھانے پر زور دیا جانا چاہیے۔ .R.W.A کے چیئرمین مرزا شاہد بیگ چنگیزی نے کہا کہ 800 سال تک اردو و فارسی ہی وجود میں تھی مگر آزادی کے بعد صرف کچھ سال میں ہی ہندی زبان نے اردو کو پیچھے چھوڑ دیا جب کہ یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی بہنیں ہیں تو پھر اردو کے ساتھ یہ برتاؤ کیوں؟ اس لیے تمام نوجوانوں سے گزارش ہے کہ وہ اردو کی بقا کے لیے آگے آئیں اور اردو سیکھیں۔ مذاکرے میں چودھری متین احمد نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ .R.W.A کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر فہیم بیگ نے نظامت کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے اس حال کے لیے ہم لوگ ہی ذمے دار ہیں۔ ہم نے اپنی تہذیب اور ادب کو طاق میں رکھ دیا ہے اور اردو زبان کی شکل بگاڑ کر رکھ دی۔ آخر میں R.W.A کے صدر جمیل احمد نے شرکت کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ **(ہمارا سماج، نئی دہلی)**

● مالیر کوٹلہ۔ 19 مئی، گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ کے شعبۂ اردو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے قائم کیے گئے اردو اسٹڈی سینٹر کے زیر اہتمام ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت کالج کے شعبۂ اردو کے صدر اور کل ہند انجمن اردو اساتذہ جامعات ہند کے نائب صدر نے کی۔ اس تقریب میں مالیر کوٹلہ کے علاوہ پنجاب کے مختلف شہروں سے اردو ڈپلوما کورس کے طلبہ شریک ہوئے۔ ان طلبہ میں سرکاری افسران، صحافی، وکلا، اساتذہ اور تاجر وغیرہ شامل ہوئے۔ اس سال 72 طلبہ نے اردو ڈپلوما کورس میں داخلہ لیا ہے۔ ان تمام طلبہ کو ڈاکٹر محمد اقبال کی جانب سے قومی کونسل کی جانب سے تیار کردہ نصابی کتاب تقسیم کی گئیں۔ انھوں نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان ہماری تہذیب وتمدن اور ثقافت کی زبان ہے۔ انھوں نے حاضرین سے کہا کہ اردو کا سرمایہ نئی نسل کو منتقل کیا جائے۔ اس تقریب میں شعبۂ اردو کے اساتذہ ڈاکٹر محمد رفیع، ڈاکٹر منظور حسن، پروفیسر عبدالرشید نے بھی خطاب کیا۔ اردو اور پنجابی شاعر ناز بھارتی، انجم قادری اور ڈاکٹر انوار احمد انصاری نے اپنا کلام پیش کرکے حاضرین کو محظوظ کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 12 مئی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار پروفیسر انیس الرحمٰن نے کہا کہ ملک وملت کا مستقبل تابناک بنانے کے لیے مسلمانوں کو ابتدائی تعلیم کے مزید معیاری مراکز قائم کرنے چاہئیں۔ وہ آج یہاں گاڈس گریس اسکول میں تقسیم انعامات اور ایوارڈ کی سالانہ تقریب میں بطور مہمان خصوصی خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں میں تعلیم وتربیت کے تئیں بیداری آئی ہے لیکن ابھی اس سمت میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اسکول کے بانی ڈاکٹر سید ظفر محمود کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے انھیں مبارکباد پیش کی۔ اس موقع پر پروفیسر انیس الرحمٰن نے اسکول میں تعلیمی اور غیر نصابی میدان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ وطالبات کو انعامات سے بھی نوازا۔ ان بچوں میں بشریٰ تیاگی، جھلک، رضیہ خاتون، رافعہ خاتون، محمد ذہین الدین، شاہد انور، نوشین فاطمہ، ثمین ناصر اور آفرین کمال کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر اسکول کی پرنسپل ڈاکٹر ناظرہ نے کہا کہ ہمارا نشانہ یہ ہے کہ قوم کے نونہالوں کی اعلیٰ تربیت کرکے انھیں اس لائق بنادیا جائے کہ وہ نہ صرف خود کو بلکہ ملک وقوم کی بھی ایک روشن مستقبل کی طرف لے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلم بچوں میں صلاحیت کی کوئی کمی نہیں ہے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انھیں اپنی صلاحیت کو اجاگر کرنے کا موقع دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے غریب بچوں کی طرف خصوصی توجہ دی ہے اور پچھلے کئی سالوں میں اس نئے رجحان کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ تقریب میں والدین نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

مشاعرے

دیکھ کر ان کو یہ اک لمحے کو رک جاتا ہے
ہائے اس دل کو دھڑکنا بھی نہیں آتا ہے
کمال احمد صدیقی

● نئی دہلی۔ 3 جون، میڈیا اینڈ انٹرٹینمنٹ ریسرچ فاؤنڈیشن اور اردو تہذیب ڈاٹ نیٹ کے زیر اہتمام غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں

ایک گنگا جمنی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے میں سی پی آئی کے ترجمان اتل کمار انجان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح جمنا میں پانی سوکھنے کے باوجود اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی اسی طرح اردو کی تمام تر مخالفت کے باوجود اردو کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کی جبکہ ڈاکٹر اے اے خان نے بطور مہمان ذی وقار شرکت کی۔ جامعہ کوآپریٹیو بنک کے ڈائرکٹر مرزا فرید الحسن بیگ نے شمع روشن کیا۔ شریک شعرا کے اسمائے گرامی ہیں:

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، شیدا اعظمی، ملک زادہ جاوید، سلیم شیرازی، فصیح چودھری، چودھری نوازش مہدی، فرمان چودھری، عادل رشید، جاوید قمر، رہبر دہلوی، شبنم نسیم، شررا عظمی، باقی حیا، ماہر سیوہاروی، پرشوتم ابی، نسیم نوری، وشال اگنی ہوتری، شریسکر گوڑ اور مشرف چودھری نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ جب کہ ملک زادہ جاوید نے نظامت کے فرائض بخوبی انجام دیے۔ مشاعرہ دیر شب کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

(ہمارا سماج، دہلی)

اگر قاتل بہادر ہو تو جاں بخشی بھی ممکن ہے
مگر بزدل سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی
فاروق ارگلی

● نئی دہلی۔ 2 جون، نئی دہلی کے زیر اہتمام علامہ رمز آفاقی مرحوم کی ساتویں برسی پر ایک مشاعرہ، بیادِ رمز آفاقی، روبینہ منزل، دریا گنج دہلی میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت دہلی کے سینئر کانگریسی رہنما ضیاء الحق سوز حقی نے کی۔ مہمان خصوصی فاروق ارگلی تھے۔ مشاعرے کی نظامت منفرد لب و لہجے کے شاعر ڈاکٹر ایم آر قاسمی نے کی۔ شمس رمزی نے علامہ رمز آفاقی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں ایک عظیم شاعر اور بے نظیر عروضی قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ علامہ کے تلامذہ کا حلقہ وسیع ہے اور تمام تلامذہ فن عروض سے واقفیت رکھتے ہیں۔ محمود صدیقی نے کہا کہ آج علامہ رمز آفاقی کی ساتویں برسی پر انھیں یاد کیا جانا بزرگوں سے بے پناہ عقیدت مندی کی دلیل ہے اور جو لوگ اپنے بزرگوں کی یاد کو زندہ رکھتے ہیں وہ خود بھی مستقبل میں زندہ رہتے ہیں کیونکہ آنے والی نسل کو اس سے تحریک ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ رمز آفاقی نے ادب کے جو چراغ روشن کیے ہیں وہ ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ بعد ازاں علامہ رمز آفاقی کی حمد و نعت سے مشاعرے کا آغاز ہوا۔ فاروقی ارگلی، ضیاء الحق سوز حقی، شمس رمزی، شہباز ندیم ضیائی، فصیح اکمل، ندیم دہلوی، رؤف رضا، معین شاداب، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، سیف سحری، جاوید مشیری، ایس یو ظفر، اقبال اشہر، عادل رشید، فصیح چودھری، احمد علوی، راشد عزیز، انا دہلوی، وارث وارثی، عرفان طالب، مسرور شاہجہانپوری اور مجیب صدیقی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ بعد ازاں سید مجیب الرحمٰن نے شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ یہ مشاعرہ رات آٹھ بجے شروع ہو کر ایک بجے شب بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

شام سے کون میرے دھیان میں ہے
روشنی ہر طرف مکان میں ہے
شین کاف نظام

● جودھپور۔ 2 جون، حضرت بھولے پیر شاہ کے 153 ویں عرس کے موقع پر ''بزمِ اردو'' اور ''درگاہ کمیٹی'' کے زیر اہتمام مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اے ڈی راہی نے کی۔ مشاعرے میں شریک شعرا کے نام اور کلام ملاحظہ کیجیے:

شین کاف نظام، اے ڈی راہی، ڈاکٹر فرید آفریدی، امین جودھپوری، حبیب کیفی، سرفراز شاکر، ڈاکٹر نثار راہی، برجیش عنبر، امیش ساحل، روف رافت۔

(ڈاک سے)

میں تو اک سبزۂ خودرو ہوں مجھے کیا ڈر ہے
جتنا کاٹا گیا اتنا ہی مرا سر نکلا
فرحت احساس

● نوئیڈا۔ 20 مئی، نوئیڈا کے سلور سٹی میں جشن بہار شاعری نامی ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں امریکہ سے حمیرالرحمٰن، پاکستان سے عنبریں حسیب عنبر ہستیاں تشریف لائیں۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے محترمہ کامنا پرساد نے شرکت کی اور مسند صدارت پر محترمہ حمیرالرحمٰن صاحبہ رونق افروز تھیں۔ جب کہ نظامت کے فرائض طالب زیدی نے انجام دیے۔ کئی زبانوں کی معتبر شخصیات نے بڑی تعداد میں شریک ہو کر ہر شاعر سے چار چار پانچ پانچ غزلیں سنیں اور داد و تحسین سے نوازا۔ نشست کا اہم مقصد نوجوان، باذوق سامعین کی ذہنی تربیت اور ان میں ادبی و ثقافتی شعور بیدار کرنا اور ان کو عصری شعری سرمائے سے واقف کرانا بھی تھا۔ شعرائے کرام کے نام ہیں: الرحمٰن (امریکہ)، فرحت احساس، عنبریں حسیب عنبر (پاکستان)، عمر سالم العید روس (سعودی عرب)، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، ہمایوں ظفر زیدی، طالب زیدی، محترمہ وسیم راشد، حیدر زیدی (الٰہ آباد)، امیر زیدی (دہلی)، احمد علوی، شکیل حسن شمسی، ناظم نقوی، انور رضوی۔ **(صحافت، دہلی)**

رسم اجرا

بہ نوک خاری رقصم

● نئی دہلی۔ 9 اپریل، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور آؤٹ ریچ پروگرام کے اشتراک سے آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دیار میر تقی میر میں ممتاز نقاد اور شاعر

خورشید الاسلام مرحوم کے شعری مجموعہ ''بہ نوک خارمی رقصم'' کا اجرا ڈاکٹر خلیق انجم کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ تقریب رسم رونمائی کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کی جبکہ نظامت خواجہ ایم شاہد نے کی۔ واضح رہے کہ یہ کتاب خورشید الاسلام کی اہلیہ ساجدہ خورشید الاسلام نے مرتب کی ہے اور مکتبہ جامعہ نے اسے شائع کیا ہے۔ پروفیسر مشیر الحسن نے صدارتی تقریر میں خورشید الاسلام کی کتاب '' تھری مغل پوئٹس'' کا خصوصیت سے ذکر کیا اور کہا کہ انگریزی ادبیات میں اسے حوالہ جاتی کتاب میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے خورشید الاسلام کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ وہ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ پروفیسر شہریار نے اس موقع پر اپنے استاد پروفیسر خورشید الاسلام کی صلاحیتوں اور ہمہ جہت ادبی خدمات کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ خورشید الاسلام بہترین استاد ہی نہیں بلکہ ایک اچھے مربی بھی تھے اور طلبہ کے ساتھ ان کے روابط نہایت خوش گوار ہوا کرتے تھے۔

مکتبہ جامعہ کے مینجنگ ڈائرکٹر پروفیسر محمد میاں نے حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ خواجہ شاہد نے کلمات تشکر ادا کیے۔ آؤٹ ریچ کی اعزازی ڈائرکٹر رخشندہ جلیل کے علاوہ تقریب اجرا میں خورشید الاسلام مرحوم کی اہلیہ ساجدہ اور ان کے بیٹے ڈاکٹر طارق الاسلام بھی موجود تھے۔ اس موقع پر جامعہ اور دہلی کی معتبر ادبی شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی جن میں مخمور سعیدی، ڈاکٹر سید عبدالباری، غضنفر زیدی، پروفیسر فرحانہ صدیقی، پروفیسر قمر غفار، پروفیسر شمس الحق عثمانی، پروفیسر عبدل بسم اللہ، ڈاکٹر رضی احمد کمال، پروفیسر احرار، پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر شہزاد انجم، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر سید شاہ علی، خالد بن سہیل، ڈاکٹر نجم السحر ثاقب، ڈاکٹر عبدالستار، ڈاکٹر رحمان مصور اور ڈاکٹر سہراب وغیرہ شامل تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رتمن رنگ

● جموں۔ 26 اپریل، جموں وکشمیر کلچرل اکادمی جموں کے، کے. ایل. سہگل ہال میں ایک پُر وقار تقریب میں انجمن فروغ اردو کی جانب سے مرحوم پروفیسر شام لال کالڑا عابد پیشاوری کے اردو دوہوں کی کتاب '' رتمن رنگ'' کا اجرا ہوا۔ شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی کے سابق سربراہ جناب پروفیسر ظہورالدین نے صدارت کے فرائض انجام دیے جب کہ کشمیر ٹائمز پبلی کیشنز کے چیئرمین جناب وید بھسین اور گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل پروفیسر ایم ایل پروانہ مہمانانِ خصوصی تھے۔ انجمن کے صدر امین بانہالی بھی تشریف فرما تھے۔

ڈاکٹر ٹی آر رینہ نے اپنے مقالہ میں عابد پیشاوری کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے دوہوں کی کتاب پر اور اردو اکادمی دہلی کی طرف سے شائع شدہ عابد کی منتخب غزلیات کی کتاب '' انتخاب کلام عابد پیشاوری'' پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے عابد کی شعری صلاحیتوں سے اہلِ محفل کو روشناس کرایا۔ نامور شاعر عرش صہبائی نے اپنے مختصر مگر جامع مقالہ میں مذکورہ دوہوں کی کتاب پر تبصرہ بھی کیا۔ ڈاکٹر رنجیت ورما اور ڈاکٹر لیاقت جعفری صاحبانِ صدور نے عابد پیشاوری سے اپنے ذاتی تعلقات کا تذکرہ کیا اور ان کی استادانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو ایک نامور محقق اور تنقید نگار بتایا۔ عابد پیشاوری کی بیگم کیلاش کالڑا، ان کی بیٹی کرن اور ان کے خاندان کے دیگر افراد بھی محفل میں موجود تھے۔ نظامت انجمن کے سکریٹری خورشید کاظمی نے کی۔ (ڈاک سے)

گونج

● ابن سینا اکادمی، علی گڑھ کے ہال میں 19 اپریل 2009 کو مرحومہ عزیز بانو داراب وفا کے مجموعۂ کلام ''گونج'' کے اجرا کی محفل آراستہ کی گئی۔ جلسے کی صدارت پروفیسر ذکیہ صدیقی نے کی۔ جلسے کی ابتدا میں پروفیسر سید ظل الرحمٰن نے حاضرین کو خوش آمدید کہا اور عزیز بانو داراب وفا کے کلام پر روشنی ڈالی۔ بعدازاں پروفیسر شہریار نے رسم رونمائی ادا کی۔ پروفیسر عزیز الدین طارق نے وفا کے کلام پر چند الفاظ سامعین کے گوش گزار کیے۔ سید معین الدین علوی نے، جو اس کتاب کے مرتب بھی ہیں۔ بتایا کہ وفا کو نام ونمود کی آرزو تھی نہ شہرت کی تمنا۔ یہی سبب تھا کہ انھوں نے اپنی تخلیقات کبھی رسائل میں اشاعت کے لیے ارسال نہیں کیں۔ بعد ازاں پروفیسر شافع قدوائی نے بانو داراب وفا کے کلام پر ایک تجزیاتی اور تنقیدی مقالہ پیش کیا۔ اس زمانے کی شاعرات کا جائزہ لیتے ہوئے وفا کا شاعری میں مقام متعین کیا۔ جناب امتیاز احمد صاحب نے بانو داراب وفا پر وہ مضمون پڑھا جو قرۃ العین حیدر نے ان کے سانحۂ ارتحال پر تحریر کیا تھا اور جو شامل دیوان ہے۔ قرۃ العین حیدر ان کی قریبی دوست اور ہم درس تھیں۔

پروفیسر زاہدہ زیدی نے وفا سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا اور کہا کہ عزیز بانو کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے سو جایا کرتی تھیں لیکن سوتے سوتے وہ باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ شاعری میں وہ اپنے لیے مذکر کا صیغہ اختیار کرتی تھیں۔ جب میں نے پوچھا کہ تم عورت لہجے میں شاعری کیوں نہیں کرتیں تو بانو نے کہا کہ '' مجھے شرم آتی ہے'' لیکن بعد میں انھوں نے تانیث کا صیغہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ وفا کے کلام کی

تعریف فقط دو الفاظ میں کی جاسکتی ہے ''عشق اور نارسائی''۔

پروفیسر شہریار نے کہا'' مشاعرے کی شاعرات کے بارے میں میری رائے بہت اچھی نہیں ہوتی لیکن انھوں نے مجھے اپنے کلام سے بہت متاثر کیا'' اور وفا کی ایک غزل اپنے مخصوص لب و لہجے میں سامعین کے سامنے پیش کی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ ان کی پوری شاعری اپنی ذات کی شناخت کی آئینہ دار ہے اور ان کے دو خوب صورت شعر سنائے:

ہم ایسے پیڑ ہیں جو چھاؤں بانٹ کر اپنی
شدید دھوپ میں خود سائے کو ترستے ہیں
میں اس کی گرد ہٹاتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں
وہ آئینہ ہے مجھے خود شناس کردے گا

محترمہ ذکیہ صدیقی صاحبہ نے فرمایا کہ انھوں نے اپنے دور میں ویمنس کالج میں مشاعروں کی بنیاد ڈالی تاکہ کالج کی لڑکیوں میں اردو سے رغبت پیدا ہو۔ عزیز بانو داراب وفا ہر سال کالج کے مشاعرے میں شرکت کرنے آیا کرتی تھیں۔

محفل کے شرکا میں پروفیسر وارث کرمانی، پروفیسر مہدی رضا، پروفیسر اطہر صدیقی، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر مسعود الحسن، پروفیسر فرحت اللہ خاں، پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر صبیح الدین علوی، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن، ڈاکٹر راحت ابرار، ڈاکٹر انیس انصاری، ڈاکٹر طارق چھتاری، جناب جمیل اختر، جناب مہر الٰہی ندیم، جناب حبیب الرحمٰن چغانی، جناب عطا خورشید، جناب ظہور احمد، جناب ثاقب صدیقی، جناب خالد فریدی، جناب خالد ندیم فاروقی، جناب افضال احمد زیدی اور جناب نجم الدین عباسی۔

پروفیسر عطیہ عابد، محترمہ جوہر یوسف، محترمہ انجمن آرا انجم، محترمہ شائستہ بیدار، محترمہ شوکت عزیز الدین، محترمہ خالدہ علوی، محترمہ پروین عباسی، محترمہ تبسم اور سمن اشرف کے علاوہ بڑی تعداد میں معزز شخصیات شامل تھیں۔

(ڈاک سے)

ارمغانِ حجاز — منظوم اردو ترجمہ

● بنگلور۔ 24 مئی، ''ارمغانِ حجاز'' کے منظوم ترجمے کا اجرا کرنے کے بعد الامین تحریک کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے کہا کہ جناب سید احمد ایثار کا علامہ اقبال کی فارسی کتابوں کے ترجمے کا اردو زبان اور ادب پر ان کا ایک احسان ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایثار صاحب کے ترجموں کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ان دنوں فارسی، کا فہم ختم ہو چکا ہے۔ لیکن ایثار صاحب نے علامہ اقبال کے فارسی کلام کا اردو میں ترجمہ کرکے محبانِ اردو کو ایک تحفہ دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ روزنامہ سالار نے اردو زبان کے فروغ کے لیے ہمیشہ پہل کی ہے اور اردو لکھنے اور پڑھنے والے احباب کی ہمت افزائی کرتے ہوئے ان کے لکھے مضامین کو شائع کرتا آرہا ہے۔ انھوں نے ایثار پبلشنگ ہاؤس ٹرسٹ سے گزارش کی کہ ریاست کی تمام لائبریریاں، ایثار صاحب کے ترجمے کردہ تمام کتابوں کو خریدیں تاکہ نوجوان نسل اس سے استفادہ کرسکے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے سید احمد ایثار صاحب کی اردو خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں مبارکباد پیش کی۔ منگلور وگوا یونیورسٹی کے سابق چانسلر و روزنامہ سالار کے مدیر اعلیٰ پروفیسر بی شیخ علی صاحب نے کہا کہ کہنہ مشق شاعر و مترجم جناب سید احمد ایثار صاحب نے صرف علامہ اقبال کے کلام کا ہی منظور ترجمہ پیش نہیں کیا ہے۔ بلکہ رباعیات عمر خیام، رباعیات شمس تبریز، رباعیات سعدی مثنوی، مولانا روم کے منظوم ترجمے کا کام بھی مکمل کردیا ہے جو زیر اشاعت ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کو علامہ بنانے میں پانچ محرکات شامل تھے، وہ ہیں ایمان ویقین، قرآن، علم عرفان، آب سحرگاہی اور مولانا روم۔ اس کے علاوہ علامہ کی صفات کے پانچ عناصر تھے وہ بے قیدی، خوشی، درویشی، کم آمیزی وحق گوئی و بے باکی۔ پروفیسر شیخ علی نے کہا کہ ''ارمغان حجاز'' کو بھی علامہ اقبال کی تعلیمات کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ کی فارسی کی جملہ سات تصانیف میں ''ارمغان حجاز'' آخری تصنیف ہے جو آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اس میں کل 391 رباعیات ہیں جو پانچ اہم ابواب میں منقسم ہیں۔ وہ ہیں حضور حق، حضور رسالت، حضور ملت، حضور عالم انسانی اور بہ یاران طریق، سارے ارمغان حجاز کا نچوڑ ایثار صاحب نے اپنے مقدمے میں دے دیا ہے۔ اس سے قبل گل گاؤں، مہاراشٹر سے آئے معروف محقق و نقاد ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط صاحب نے اپنے خطاب میں کہا کہ سید احمد ایثار صاحب کی کتابوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہر ایک کتاب پر ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے، جس سے ان کے ترجمے کے ذریعے علامہ اقبال کو سمجھنے میں کافی آسانی ہوجاتی ہے۔ ان کے علاوہ کٹک اڑیسہ سے آئے پروفیسر ڈاکٹر کرامت علی کرامت صاحب کرناٹک اور اردو اکادمی کے سابق صدر جناب وہاب عندلیب صاحب نے خاکہ اور کتاب پر تبصرے پیش کیے۔ رسم اجرا کی تقریب کا آغاز قاری رضوان اللہ بیگ شمسی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ سی ایم اے کے صدر الحاج مقبول احمد صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں نعت پاک پیش کی۔ تقریب کے کنوینر و روزنامہ سالار کے ادبی مدیر جناب محمد اقبال نے تمام مہمانوں کا خیر مقدم و تعارف کروایا اور نظامت کی۔ آخر میں کتاب کے مصنف جناب سید احمد ایثار صاحب نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

(سالار، بنگلور)

صحافت کے اصول

● حیدرآباد۔ 25 اپریل، موجودہ دور میں صحافت نے جہاں تکنیکی بنیادوں پر کئی ایک سنگ میل طے کیے وہیں تشویش کی بات یہ ہے کہ آج کی صحافت نے بے باکی اور بدتمیزی میں فرق کو فراموش کر دیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز مزاح نگار پدم شری مجتبیٰ حسین نے کیا۔ وہ آج مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں کارگزار وائس چانسلر کے آر اقبال احمد کی کتاب ''صحافت کے اصول'' کی رسم رونمائی انجام دینے کے بعد اظہار خیال کر رہے تھے۔ یہ کتاب پریہ درشنی ساہتیہ پرکاشنی، بنگلور نے شائع کی ہے۔ تقریب رسم اجرا کا اہتمام یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت نے کیا۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ جب صحافت میں لیتھو پریس رائج تھا تب لکھائی کے لیے زرد رنگ کی روشنائی استعمال کی جاتی تھی لیکن صحافت میں زرد صحافت کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی لیکن آج صحافت کی افسوسناک صورت حال ہے۔ لیتھو پریس کی جگہ آفسیٹ مشینوں نے لے لی مگر صحافتی غیر جانبداری اور اصولوں کو پامال کر کے عملاً زرد صحافت کو اپنایا جا رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے مطابق ملک کی جدوجہد آزادی میں اگر کسی زبان کی صحافت نے حصہ لیا ہے اور جنگ لڑی ہے تو وہ اردو صحافت ہی ہے۔ یہاں تک کہ پہلا شہید صحافی کوئی اور نہیں بلکہ اردو صحافی مولوی محمد باقر ہی ہے۔ پروفیسر کے آر اقبال احمد کو صحافت کے اصول نامی کتاب تحریر کرنے پر مبارکباد دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ کتاب جرنلزم کے طلبہ کے لیے کافی اہم ہے۔ اس کی اشاعت فال نیک ہے۔ ''صحافت کے اصول'' کی تقریب رسم رونمائی کی صدارت پروفیسر اے ایم پٹھان، وائس چانسلر سنٹرل یونیورسٹی آف کرناٹک، گلبرگہ نے کی۔ انھوں نے پروفیسر اقبال احمد کو مبارکباد دی کہ انھوں نے اردو میں ایک ایسی کتاب لکھی ہے جس کی بہت ضرورت تھی۔ پروفیسر پٹھان نے کتاب پر تبصرہ کرنے کے لیے پروفیسر بیگ احساس، صدر شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کی ستائش کی کہ انھوں نے کتاب کا نہ صرف بغور مطالعہ کیا بلکہ اس کے مثبت اور منفی ہر دو پہلوؤں سے آگاہ کیا۔ پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے پروفیسر اقبال احمد کی کتاب ''صحافت کے اصول'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر اقبال ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ابھی تک 16 سے زائد کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ دو سے زائد زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ تاریخ کے استاد ہیں مگر فلسفہ اور صحافت سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ انھوں نے کتاب ''صحافت کے اصول'' کو جرنلزم کے طلبہ کے لیے نہایت معلوماتی قرار دیا۔ پروفیسر منظورالامین نے بھی کتاب پر سیر حاصل تبصرہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ بہتر ہوتا کہ مصنف کرناٹک کے علاوہ دیگر ریاستوں میں بھی اردو صحافت کا جائزہ لیتے۔ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج مرکز برائے اردو زبان وثقافت نے خیر مقدمی کلمات کہے اور آفتاب عالم بیگ، اسسٹنٹ ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر انچارج رجسٹرار پروفیسر ایس اے وہاب، ڈین پروفیسر ٹی وی کٹی، سی ایم ایشوریا، فینانس آفیسر کے علاوہ اساتذہ، عہدیداروں، ریجنل سنٹر ڈائرکٹرس اور اسٹڈی سنٹرس کو آرڈینیٹرس کی بڑی تعداد موجود تھی۔

(منصف، حیدرآباد)

سونی پرچھائیاں

● بنگلور۔ 31 مارچ، کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے رواں سال کا اکادمی کا اختتامی اجلاس مرحوم محمود ایاز کی 12 ویں برسی کی یاد میں منایا گیا۔ نامور نقاد شاعر وادیب جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو خصوصی طور پر اس اجلاس کے لیے مدعو کیا گیا تھا، جنھوں نے اپنے خطبے میں مغربی ادب کے حوالے کے ذریعے جدید ادب پر روشنی ڈالی۔ خطبے سے قبل جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاتھوں ریاست کی ممتاز شاعرہ محترمہ شائستہ یوسف کے شعری مجموعے ''سونی پرچھائیاں'' اور اکادمی کے سہ ماہی ادبی جریدے ''اذکار'' کے 10 ویں شمارے کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ جناب فاروقی نے اردو میں تانیثی شاعری کے حوالے سے شائستہ یوسف کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ ان کی شاعری خاموش ماورائی حیثیت کی حامل ہے۔ ''اذکار'' کے بارے میں انھوں نے کہا کہ انھیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس شمارے میں نئے قلم کاروں کی تخلیقات بھی شامل ہیں۔ شائستہ یوسف نے اپنی کتاب کی اشاعت اور رسم اجرا پر اکادمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے تخلیقی سروکار کا اظہار کیا۔ جناب عزیز اللہ بیگ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اظہار خیال کیا کہ محمود ایاز فاروقی صاحب کی ادبی قامت کے معترف تھے اور یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں انھیں سننے کا موقع ملا ہے۔ جناب خلیل مامون صدر کرناٹک اردو اکادمی نے اپنے صدارتی خطاب میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے لکچر کی ستائش کی اور فرمایا کہ فاروقی نے اردو ادب میں عالم کاری کی کارگزاریوں کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مغربی افکار ونظریات نے برصغیر میں نہ صرف ادب کو متاثر کیا بلکہ زندگی کے دیگر شعبے بھی ان سے متاثر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لکھنے والوں اور آئین کو ان باتوں کی آگہی ہونی چاہیے کہ عالم کاری کے نام پر بین الاقوامی عناصر اور مفاد پرست طاقتیں کس طرح انھیں اپنی سازش کا شکار بنا رہی ہیں۔ اس اجلاس کا آغاز پروفیسر ایس محمد رحمت الحق رجسٹرار، کرناٹک اردو اکادمی کی خیر مقدمی تقریر سے ہوا۔ جناب اکرم نقاش (گلبرگہ) نے جناب فاروقی کا جامع تعارف پیش کیا اور انھی کے شکریے پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

(سالار، بنگلور)

مطلع نظر

● کانپور۔ 5 اپریل، خوش گو شاعر اور فن شناس ادیب فاروق جائسی کی کتاب ''مطلع نظر'' کی رسم اجرا معروف شاعر و نقاد جناب نامی انصاری کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس موقع پر پروفیسر شارب ردولوی نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''کتاب کے ہر مضمون کا اختتام نتیجہ خیز ہے جس میں روایتی تنقیدی نظریات کا سہارا نہیں لیا گیا ہے۔'' پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ ''اس کتاب کو تحقیق اور تذکرہ کے ضمن میں رکھا جاسکتا ہے جس میں قدما کے ساتھ ساتھ ہم عصروں کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔'' خان احمد فاروق نے کہا کہ ''اس کتاب کا سرورق نہایت دلچسپ اور جاذب نظر ہے جو ہمارے عہد میں حرف کی بے توقیری کی جانب اشارہ کرتا ہے۔'' الہ آباد ہائی کورٹ کے سینئر ایڈوکیٹ ایم اے قدیر نے کہا کہ ''مطلع نظر'' کا تعلق کسی ازم یا نظریہ سے نہیں ہے بلکہ اس کتاب میں صالح ادب کی پیروی کی گئی ہے۔'' عشرت ظفر نے کہا کہ ''یہ کتاب اس حد تک متنوع اور دلچسپ ہے کہ اسے نگارخانۂ مطبوع بھی کہا جاسکتا ہے۔'' اس موقع پر ''انوارقوم'' کے چیف ایڈیٹر زبیر احمد فاروقی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا کہ ''ہم اردو کو اپنے گھروں میں واپس لائیں تاکہ ان کتابوں کو آنے والی نسلیں بھی اسی رسم خط میں پڑھ سکیں۔'' سید وسیم الحسن ہاشمی، سید ابوالحسنات حقی، مولانا قاسم حبیبی، ڈاکٹر نغمہ جائسی، ناظر صدیقی، شعیب نظام، ڈاکٹر کمل مسدی، ظفر احمد غازی نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ جلسے کا آغاز مولانا میکائیل ضیائی نے تلاوت قرآن پاک سے کیا اور نظامت خان احمد فاروقی نے کی۔ (ڈاک سے)

آخری ادھیائے

● چنڈی گڑھ۔ ڈاکٹر اے آر قدوائی گورنر ہریانہ نے پدم شری کشمیری لال ذاکر کے ایڈز کے موضوع پر لکھے ناول '' آخری ادھیائے'' کی رونمائی کی رسم ادا کی، جس کی صدارت جناب ایچ کے دوآ، چیف ایڈیٹر ''دی ٹریبون'' چنڈی گڑھ، نے فرمائی یہ تقریب ہریانہ راج بھون چنڈی گڑھ میں منعقد کی گئی۔ یہ ناول عالمی شہرت یافتہ مطبع پینگوئن کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ جس کے متعلق گورنر موصوف نے فرمایا کہ ذاکر صاحب کی تحریریں اعلیٰ قدروں اور بہتر سماج کی تعمیر کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے ذاکر صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ بطور ادیب ایک طویل عرصے کا تجربہ ان کے سامنے ہے جس کا فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔ اس سے قبل ذاکر صاحب نے اپنے ناول '' آخری ادھیائے'' کے حوالے سے ازخود گفتگو کی اور بتایا کہ اس ناول کو تحریر کرنے میں انھیں کم و بیش آٹھ برس کا عرصہ لگا اور اس دوران وہ مختلف مراحل سے گزرے اور ایڈز کے بارے میں بین الاقوامی سطح کی معلومات حاصل کرکے انھیں موضوع سے مربوط کیا۔ ڈاکٹر فرحت رضوی نے ناول '' آخری ادھیائے'' پر اپنا تفصیلی تجزیہ پیش کیا اور ناول کو موجودہ اردو فکشن کی اہم ترین تصنیف قرار دیا۔ چنڈی گڑھ سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت انگریزی روزنامہ ''ٹریبون'' کے چیف ایڈیٹر جناب ایچ کے دوآ نے اپنے صدارتی خطبے میں ذاکر صاحب کی اس کاوش کو سراہا اور ایڈز جیسے موذی مرض کے لیے جاگروکتا کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے آخری ادھیائے کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا۔ ڈاکٹر کملیش موہن نے سبھی مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ جناب شمس تبریزی نے تقریب کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(ڈاک سے)

ایک ممنوعہ محبت کی کہانی

● ممبئی۔ 24 اپریل، پریس کلب، سی ایس ٹی ممبئی، میں جواں سال ناول نگار رحمٰن عباس کے دوسرے ناول ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' کی رسم اجرا مشہور اردو فکشن رائٹر سلام بن رزاق کی صدارت میں، تعلیم و تدریس سے منسلک شخصیت نجم الحسن تاراپور والا کے ہاتھوں ہوئی۔ مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے ''اعتراف گروپ'' کے رکن اور ڈراما نگار اسلم پرویز نے کہا کہ بہت دنوں بعد ایک اچھا ناول اردو قارئین کے سامنے آیا ہے۔ سلام بن رزاق نے ناول پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں جو قابل ذکر ناول اردو میں لکھے گئے ہیں، میں ان میں رحمٰن عباس کے اس ناول کو شمار کروں گا۔ یہ ناول خطۂ کوکن کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن کوکن کا سفرنامہ نہیں ہے بلکہ صرف ایک گاؤں کی کہانی ہے۔ ہندی میں آنچلک ناول کی روایت ہے لیکن اردو میں نہیں، البتہ اب رحمٰن عباس کا یہ ناول آپ کے سامنے حاضر ہے جو صحیح معنوں میں آنچلک ناول اور لوا سٹوری ہے۔ مشہور ادیب ساجد رشید نے کہا کہ ادب پر ہمیشہ شمالی ہند کا غلبہ رہا ہے۔ پہلی بار اس ناول کے ذریعے الگ فضائیں تلاش کی گئی ہیں۔ ناول کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کوکن کے کلچر کے حوالے سے احتجاج کی ایک دبی آواز ابھرتی ہے۔ بہت دنوں بعد ایک ایسا ناول منظر عام پر آیا ہے جو ناول نگاری کی روایتی ڈگر سے الگ ہٹ کر لکھا گیا ہے۔ اس کے ذریعے کوکنی برادری کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معروف افسانہ نگار مقدر حمید نے کہا کہ اس ناول کو پڑھتے ہوئے مجھے ایسا لگا کہ کہیں میں انگریزی ناول تو نہیں پڑھ رہا ہوں جس کا سبب ناول کا تجسس اور تکنیک ہے۔ یعقوب راہی نے ناول میں کلچر، زبان اور ثقافتی روایت پر جو

سوالات اٹھائے گئے ہیں، ان پر اپنے اعتراضات درج کیے لیکن یہ بھی کہا کہ کوکن کے قلم کاروں میں پہلے ناول نگار کا کریڈٹ میں رحمٰن عباس کو دوں گا۔ ''جن وادی لیکھک سنگھ'' کے نمائندہ خان مختار نے کہا کہ یہ ناول لو اسٹوری ہے اس کے باوجود کئی سوالات قاری کے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ سکندر مرزا نے ناول کو ایک معصوم محبت کی کہانی سے تشبیہ دی اور کہا کہ مجھے مصنف کا انداز بیان بہت پسند ہے۔ اس تقریب میں ممبئی کے شعرا اور ادبا کے علاوہ ماہر تعلیم رؤف پٹھان اور خلافت کالج کی پرنسپل محترمہ صفیہ مقادم مہمان اعزازی کے طور پر شریک تھے۔ نظامت کے فرائض مہاراشٹر اردو اکادمی کے ایگزیکیٹو آفیسر وقار قادری نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

میری دو اور بیٹیاں

● چنڈی گڑھ۔ 6 اپریل، ہریانہ کے گورنر عزت مآب ڈاکٹر اے آر قدوائی نے تمل ناڈو کے گورنر عزت مآب سرجیت سنگھ برنالہ کی تحریر کردہ کتاب ''میری دو اور بیٹیاں'' کا آج یہاں ہریانہ راج بھون میں اجرا کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر اے آر قدوائی نے فرمایا کہ اس کتاب میں برنالہ صاحب نے اپنے جذبات اور احساسات کو شدت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے وہ برنالہ صاحب کو ایک سیاسی رہنما کے طور پر جانتے تھے لیکن اب وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں جس طرح سے دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ ایک امریکن لڑکی جو کینسر میں مبتلا ہوگئی تھی اور جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا اس کا علاج برنالہ صاحب نے اپنے پاس چنئی (تامل ناڈو) بلا کر کروایا۔ ان کی دوسری بیٹی کشمیر کی نسیم تھی جو بہت غریب اور بیمار تھی۔ برنالہ صاحب نے اس کی بھرپور مدد کی لیکن وہ بھی بچ نہ سکی اور اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئی۔ گورنر ہریانہ نے کہا کہ جو لوگ انسانیت کے ناطے غریب اور بیمار کی خدمت کرتے ہیں وہ کسی کا مذہب نہیں دیکھتے۔ ان کا ایک ہی مقصد انسانیت کی خدمت کرنا ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگ قابلِ تعریف ہوتے ہیں۔

برنالہ صاحب نے جذباتی انداز میں اس کتاب میں مذکور اپنی دونوں بیٹیوں کے بارے میں بتایا۔ ایک نسیم جو کشمیر کی رہنے والی تھی اور دوسری ایک امریکن نوجوان لڑکی کرن جوت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ 1949 میں پہلی بار کشمیر گئے تھے جہاں ان کی ملاقات نسیم اور اس کے بیمار والدین سے ہوئی۔ برنالہ صاحب نے کہا کہ ان کا نسیم سے اتنا جذباتی رشتہ ہوگیا تھا کہ انھیں بار بار کشمیر جانا پڑا اور ایک بار ان کو نسیم کا آخری خط آیا کہ ''چھوٹے ابو، میرا آخری سلام''۔ کرن جوت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ اس سے پہلی بار امرتسر میں ملے تھے۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں آپ کو پاپا کہہ سکتی ہوں کیونکہ جب سے میں نے اپنے پاپا کو کھویا ہے پاپا کہنے کو ترس رہی ہوں۔ میں نے اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہاں کردی۔ وہ مجھے پاپا کہنے لگی۔ بعد میں اسے کینسر ہوگیا۔ اس کا علاج انھوں نے چنئی میں کروایا۔ وہ ان کے پاس راج بھون میں رہنے لگی مگر بدقسمتی سے جانبر نہ ہوسکی۔ اس کی آخری رسومات ہندو اور سکھ مذہبی رسم و رواج کے مطابق کی گئیں۔

''دی ٹریبون'' کے ایڈیٹر ان چیف جناب ایچ کے دوآ نے کہا کہ یہ کتاب بیٹیوں کے لیے بے پناہ پیار کرنا سکھاتی ہے۔ انھوں نے پنجاب اور ہریانہ میں بیٹیوں کی کم ہوتی تعداد پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے برنالہ صاحب کی کتاب پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر کملیش موہن نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ شمس تبریزی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

لفظ لفظ

● جموں۔ 30 اپریل، انجمن فروغ اردو جموں و کشمیر، جموں کی جانب سے کے ایل سہگل ہال کلچرل اکادمی جموں میں منعقد کردہ ایک تقریب میں اننت ناگ کشمیر سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ ''لفظ لفظ'' کے پہلے شمارے کی رسمِ اجرا ہوئی۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید سربراہ شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی نے فرمائی۔ ایاز رسول نازکی اور عرش صہبائی مہمانِ خصوصی تھے۔ صدر انجمن بانہالی بھی صاحبانِ صدور میں شامل تھے۔

سکریٹری انجمن خورشید کاظمی نے ماہنامہ کے مدیر زاہد مختار کا تعارف کراتے ہوئے ان کے رسالے کا تعارف پیش کیا۔ پیارے ہتاش، ڈاکٹر پریمی رومانی، ڈاکٹر لیاقت جعفری اور عرش صہبائی نے ''لفظ لفظ'' کی تعریف کی اور رسالے میں شائع شدہ شذرات پر خیالات ظاہر کیے۔

صدرِ محفل اور مہمانِ خصوصی نے رسالے کے مدیر سے اپنے تعلقات کے پیشِ نظر اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ایک بار پھر ''لفظ لفظ'' منظرِ شہود پر آیا ہے۔ انھوں نے بھی کہا کہ تقریباً انتیس برس کے بعد ریاست میں دوبارہ ایسا خوبصورت اور دیدہ زیب اردو ماہنامہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ انھوں نے زاہد کو مبارک دیتے ہوئے دعا کی کہ اب یہ رسالہ چھپتا رہے۔ انھوں نے رسالے کے معیار کو قائم رکھنے کی اشد ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ نظامت انجمن کے سکریٹری نے کی۔ (ڈاک سے)

میر تنقید: تذکروں سے عہد حاضر تک

● لکھنؤ۔ 25 اپریل، ''میر تنقید۔ تذکروں سے عصر حاضر تک، ایک ایسا علمی، تحقیقی اور تنقیدی کام ہے جس کی حوالہ جاتی اہمیت ہے۔ میر ہماری شاعری

کے ایسے ستون ہیں جس پر اردو شاعری کی عمارت قائم ہے لیکن ان کے بارے میں بعض جملے اتنے مقبول ہوئے کہ ان پر لکھی جانے والی تنقید ان جملوں میں گم ہوگئی۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر ریشماں پروین نے بڑی سنجیدگی اور محنت سے از ابتدا تا حال لکھی جانے والی تنقید کا جائزہ لیا جس سے میر تنقید کے نئے ابعاد سامنے آئے ہیں۔" ان خیالات کا اظہار ممتاز ترقی پسند نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے لکھنؤ کی جی گرلس ڈگری کالج کی لکچرر ڈاکٹر ریشماں پروین کی کتاب "میر تنقید۔ تذکروں سے عصر حاضر تک" کی اجرا کی رسم انجام دیتے ہوئے اس ادبی تقریب میں کیا جو لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈی پی اے ہال میں "لوح وقلم" کی جانب سے منعقد کی گئی تھی، جس کی صدارت پروفیسر انیس اشفاق کر رہے تھے اور لکھنؤ اور بیرون لکھنؤ کے نامور ادیب وشاعر جمع تھے۔

تقریب کے صدر پروفیسر انیس اشفاق نے اس موقع پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کتاب "میر تنقید۔ تذکروں سے عصر حاضر تک" نقد میر کا ایک منفرد ومنطقی مطالعہ ہے۔ کتاب میر تنقید سے متعلق ایک اہم اور معتبر حوالہ ہے اور آئندہ میر پر قلم اٹھانے والوں کے لیے اس کتاب سے رجوع کرنا لازم ٹھہرے گا۔

ممتاز صحافی، افسانہ نگار اور نقاد عابد سہیل نے میر تنقید کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ ایک عرصے تک میر کو ایک تنہائی پسند اور محض خود بیں شاعر سمجھا گیا، ایک ایسا شاعر جس کا کاروبار زندگی سے کوئی معاملہ نہ ہو لیکن ریشماں پروین کی کتاب میر تنقید سے میر کے مختلف فنی جہات وابعاد سامنے آئے ہیں۔ جبکہ تذکروں سے معاصر تنقید تک صورت حال بالکل برعکس ہے۔

معروف جدید شاعر انیس انصاری (آئی اے ایس) نے کہا کہ ڈاکٹر ریشماں پروین نے ابتدائی تذکروں سے حالیہ تنقید تک کا دیانتدارانہ محاکمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں 1752 سے 2005 تک یعنی 253 سال میں میر سے متعلق جو افکار ونظریات سامنے آئے ہیں ان پر میر حاصل بحث کی گئی ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کی سابق وائس چانسلر پروفیسر روپ ریکھا ورما نے اس کتاب پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ معروف افسانہ نگار پروفیسر شمیم نکہت نے کہا کہ تحقیق کے ذیل میں اگر کوئی معیاری کام سامنے آتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ میں ریشماں پروین کے ساتھ ان کے نگراں پروفیسر عقیل احمد صدیقی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کو بھی مبارک باد پیش کرتی ہوں جن کی نگرانی میں یہ معیاری مقالہ لکھا گیا۔

تقریب کی نظامت کے فرائض حسین آباد انٹر کالج کے اردو لکچرر مرزا شفیق حسین شفق نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

مولانا قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات

● مئوناتھ بھنجن۔ 27 اپریل، "سر اقبال پبلک اسکول" میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی کتاب مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات کی اجرائی تقریب مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ کتاب کے اجرا کی رسم مولانا عمیر الصدیق ندوی رفیق خاص دار المصنفین، شبلی اکادمی، اعظم گڑھ نے انجام دی۔

مولانا محفوظ الرحمٰن مفتاحی نے اپنی صدارتی تقریر میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات کی معنویت آج بھی مسلم ہے اور دینی اور عصری تعلیم کے امتزاج سے ہی صالح معاشرے کی تشکیل کی جاسکتی ہے، اس لیے اپنے بچوں کی تعلیمی سمت طے کرتے ہوئے اس کتاب "مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات" سمیت مصنف کی دوسری کتابوں خصوصاً "تعلیمی جہات" اور "تعلیمی تجزیے" سے رہنمائی حاصل کی جانی چاہیے۔ ڈاکٹر شکیل احمد نے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی تعلیمی، تدریسی، ادبی اور تصنیفی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے اس کتاب کی اشاعت اور اجرا کو خوش آئند قرار دیا۔ مذکورہ اجرا کی تقریب کی نظامت ماسٹر رفیق اشفاق نے انجام دی اور پروگرام کا آغاز حافظ محمد شمیم کی تلاوت پاک اور ظہیر حسن ظہیر کی نعت شریف سے ہوا۔ (ڈاک سے)

ایک کمرہ سارا جہاں

● نئی دہلی۔ 14 مئی، محمد اکرام الحق کے انشائیوں اور خاکوں کا مجموعہ "ایک کمرہ سارا جہاں" چھپ کر منظر عام پر آگیا ہے۔ 224 صفحات کے اس مجموعے میں 26 مضامین اور خاکے ہیں۔ کتاب صاف ستھری چھپی ہے۔ سب سے اہم بات اس کتاب کا ٹائٹل ہے جس پر ملٹی میڈیا سے کمرہ اور جہاں کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زندگی کے چاروں عناصر، پانی، مٹی، آگ، ہوا پانچ پینٹنگس کو یکجا کرکے ان کی صاحبزادیوں صائمہ، صبا اور ضیا نے خوبصورت اسکیچ میں تبدیل کردیا۔ "ایک کمرہ سارا جہاں" کے ساتھ اردو کی کتابوں میں بامعنی ٹائٹل اسکیچ کی مثال کہی جاسکتی ہے۔ محمد اکرام الحق رواں اور شگفتہ نثر لکھتے ہیں۔ پیشے سے صحافی رہے ہیں۔ دوردرشن نیوز سے ڈائرکٹر نیوز کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی ذہنی پرورش کلکتہ میں ہوئی ہے۔ مومن ہائی اسکول، سٹی کالج آف کامرس اور سریندر ناتھ لا کالج کے فارغ ہیں۔ آبائی وطن بہار کا ضلع پٹنہ ہے۔ کلکتہ، بہار اور دہلی ان کی تحریروں میں پوری طرح واضح ہے، ان کی بعض خاکوں میں بلا کی اثرانگیزی ہے۔ آشفتہ چنگیزی پر ان کا مضمون ان کے طرز تحریر کا عمدہ نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ (ہمارا سماج، دہلی)

یادوں کے دریچے

● حیدرآباد۔ 17 مئی، ڈاکٹر محمد عظیم الدین بخش کی تازہ ترین تصنیف

”یادوں کے دریچے“ جوان کے اندرون و بیرون ملک سفر کی یادوں (سفرنامہ) پر مشتمل ہے جس کا بدست صدر نشین آندھرا پردیش اردو اکادمی محمد رحیم الدین انصاری رسم اجرا انجام دیا گیا۔ اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر عظیم الدین بخش کی تصنیف نہ صرف بیرونی ممالک کے متعلق مفصل معلومات فراہم کرتی ہے بلکہ یہ قاری کو عصری معلومات بھی مہیا کرتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ موصوف کی تصانیف سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ملت اسلامیہ کے لیے ایک حساس دردمند دل رکھتے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک مختلف کتاب ہے جو دوسرے قلم کاروں کو اس انوکھے موضوع پر طبع آزمائی کی دعوت دیتی ہے۔ ڈاکٹر حامد اشرف نے کہا کہ عظیم الدین بخش نے انتہائی سہل الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اپنے سفرنامے کے متعلق معلومات قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ موصوف نے اپنی تحریر کے ذریعے یہ ظاہر کیا کہ جو ذہن متحرک ہوتا ہے وہ تمام باتوں کا جو اس کے آس پاس رونما ہوتے ہیں کا احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر حامد اشرف نے کہا کہ تصنیف ”یادوں کے دریچے“ میں مصنف نے فلسطین ”کینیڈا، ناروے اور ڈنمارک کا تفصیلی ذکر کیا ہے جس کے پڑھنے والوں کو وہاں کی تہذیب و تمدن کے متعلق معلومات ہوں گی۔ انھوں نے ڈاکٹر عظیم الدین بخش کو اس بہترین تصنیف کے تحریر کرنے پر مبارکباد پیش کی اور امید ظاہر کی کہ اس سفرنامہ کے چند اقتباسات کو یونیورسٹی اپنے نصاب میں شامل کرے گی۔ اس تقریب رسم اجرا کی صدارت جناب حسن الدین احمد نے انجام دی۔ انھوں نے بھی ڈاکٹر عظیم الدین بخش کو مبارکباد پیش کی۔ تقریب کا اہتمام الانصار پبلی کیشنز، اردو جرنلسٹس ایسوسی ایشن اور فورم فار ماڈرن تھاٹ کی جانب سے کیا گیا۔ تقریب کے کنوینر صدر اردو جرنلسٹس ایسوسی ایشن سید عثمان رشید اور اسد ثنائی تھے۔

(منصف، حیدرآباد)

وفیات

حبیب تنویر

● بھوپال۔ 8 جون، ممتاز ڈراما نگار پدم بھوشن حبیب تنویر کا آج صبح 6:30 بجے یہاں ایک اسپتال میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ وہ 86 برس کے تھے، پسماندگان میں ایک بیٹی نگینہ ہے۔ ان کی اہلیہ مونیکا مشرا کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے۔ جناب تنویر پچھلے ایک ماہ سے اسپتال میں داخل تھے۔ پہلے ان کی صحت کچھ بہتر بھی ہوئی لیکن بعد میں حالت بگڑتی چلی گئی۔ جناب حبیب تنویر نے 60 کے دہے میں بھوپال میں نیا تھیٹر کی بنیاد ڈالی تھی۔ جس نے بعد میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ انھیں سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ اور پدم شری ایوارڈ ملا۔ 2002 میں انھیں پدم بھوشن سے نوازا گیا۔ وہ انڈین پیپلز تھیٹر سے بھی وابستہ رہے۔ ”چرن داس چور“ ان کا سب سے مقبول ڈراما ہے۔ ممتاز تمثیل نگار، شاعر، ادیب اور اداکار حبیب تنویر کے انتقال سے عالمی تمثیل نگاری کا انتہائی اہم باب بند ہوگیا ہے۔ تھیٹر کے بین الاقوامی خزانہ سمجھے جانے والے جناب تنویر کی موت ایسا ناقابل تلافی نقصان ہے، جس کی تلافی ناممکن ہے۔ ان کی پیدائش غیر منقسم مدھیہ پردیش کے رائے پور میں یکم ستمبر 1923 میں ہوئی تھی۔ ان کے والد حفیظ احمد خان پشاور (پاکستان) کے رہنے والے تھے۔ اسکولی تعلیم رائے پور میں اور ناگپور کے موریس کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد ایم اے کرنے کے لیے وہ علی گڑھ گئے۔ نوجوانی میں ہی انھوں نے اشعار لکھنے شروع کر دیے تھے اور اسی دوران ”تنویر“ کا تخلص ان کے نام کے ساتھ جڑ گیا۔ 1945 میں وہ ممبئی گئے اور آل انڈیا ریڈیو سے بطور پروڈیوسر وابستہ ہوگئے۔ اسی دوران انھوں نے کچھ فلموں میں گیت لکھنے کے ساتھ ساتھ کردار بھی ادا کیا۔ شطرنج کے مہرے، جن لاہور نہ دیکھیے وہ جمیا نہیں، آگرہ بازار، چرن داس چور کے علاوہ کم از کم 50 ڈراموں کو اسٹیج پر لاکر حبیب تنویر نے اسٹیج کی دنیا کی بادشاہت حاصل کی۔ ان کے انتقال پر ملک کی سرکردہ شخصیات نے اظہار تعزیت کیا۔

کملا ثریا

● ترِوننت پورم۔ 31 مئی، انگریزی اور ملیالم کی نامور ادیبہ اور مصنفہ کملا داس کا آج علی الصبح پونے میں انتقال ہوگیا۔ 75 سالہ کملا داس نے پونے کے ایک نجی اسپتال میں آخری سانس لی۔ انھیں 18 اپریل کو اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کی موت کے وقت ان کے بیٹے سبج سوریہ داس اور ان کے داماد موجود تھے۔ محترمہ کملا داس جنھوں نے 1999 میں اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام کملا ثریہ رکھ لیا تھا ان کی آخری خواہش کے مطابق انھیں پلائم کی جامع مسجد سرکاری اعزاز کے ساتھ لے جایا گیا۔ الاپوز اور کولم میں لوگوں نے ان کا آخری دیدار کیا۔ نامور ادیبوں نے ان کی موت پر سخت صدمہ کا اظہار کیا ہے۔ کیرالہ کے وزیر اعلیٰ وی ایس اچیوتا نندن نے کہا کہ ان کی موت ملیالم اور انگریزی ادب کا بہت بڑا نقصان ہے۔ وزیر دفاع اے کے انٹونی نے انھیں خاندانی دوست بتاتے ہوئے کہا کہ ان کی موت میرا ذاتی نقصان ہے۔ وزیر مملکت برائے خارجہ ششی تھرور اور کیرل کے وزیر ثقافت ایم اے بی بی نے بھی ان کی موت پر دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ملیالم زبان میں مختصر کہانیاں لکھنے کے لیے مشہور کملا ثریا نے انگریزی زبان میں بھی کچھ نظمیں لکھی تھیں جس کے لیے انھیں بین الاقوامی انعامات حاصل ہوئے۔ ان کی مشہور انگریزی کتابیں — سمران کولکاتا، دی ڈیسینڈینٹ، دی اولڈ پلے ہاؤس، اور مائی اسٹوری، وغیرہ اہم ہیں۔

چودھری حسان الدین حسان

● سری نگر۔ 6 مئی، گوجری کے ممتاز شاعر اور محقق چودھری حسان الدین حسان کا کل رات یہاں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ 98 سال کے تھے۔ حسان جو گوجر جاٹ کانفرنس کے بانی اراکین میں سے ایک تھے پچھلی صدی کی 1920 کی دہائی میں گوجر تحریک میں بہت سرگرم تھے۔ انھوں نے گوجری کے علاوہ دیگر زبانوں میں شاعری کی ہے۔ جموں اور کشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نے انھیں 1987 میں اعزاز دیا تھا۔

مظہر مہدی

● حیدرآباد۔ 29 مئی، یہ خبر ادبی حلقوں میں نہایت افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ حیدرآباد کے ممتاز شاعر مظہر مہدی کا مختصر علالت کے بعد بعمر 61 سال انتقال ہوگیا۔ ان کا اصلی نام سید زین العابدین تھا۔ وہ کامریڈ سید ابراہیم کے فرزند اور پروفیسر عالم خوندمیری کے بھانجے تھے۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے تک تعلیم حاصل کی اور ڈائرکٹوریٹ آف فیکٹریز اینڈ بوائلرز کی ملازمت سے چند سال قبل ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ وہ حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے رکن تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''لاانتہا'' (1982) اور ''ارضِ پیغمبر'' (1994) شائع ہوئے تھے۔ نثری نظم نگاری میں ان کا اپنا انداز تھا۔ انھوں نے بودلیئر کی نظموں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا اور 1999 میں کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ اردو اکادمی آندھرا پردیش نے ان کے دونوں شعری مجموعوں کو ایوارڈز سے نوازا تھا۔ نمازِ جنازہ بعد نمازِ مغرب مسجد مشکی چنچل گوڑہ میں ادا کی گئی اور تدفین بزیرہ شاہ ابراہیم کا چیکوڑہ میں عمل میں آئی۔ حیدرآباد لٹریری فورم کے وہ جوائنٹ سکریٹری تھے۔

محمود علی علیگ

● نئی دہلی۔ 20 مئی، گذشتہ روز بعد نماز مغرب معروف مورخ ماسٹر محمود علی علیگ کا انتقال ہوگیا۔ وہ نومبر سے نیوتھوریکس (پھیپھڑوں) کے مرض میں مبتلا تھے۔ وہ ایک ممتاز تاریخ داں تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز شفیق میموریل اسکول میں درس و تدریس سے کیا اور 1999 میں پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ پوری زندگی اردو ادب اور مشاعروں کے انعقاد کے علاوہ تاریخ کی ایک درجن سے زائد کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ مرحوم نہایت خلیق ملنسار اور ظرافت نگار تھے۔ ان کی گفتگو میں ایسی ظرافت ہوتی تھی کہ رونے والا شخص ہنس دیا کرتا تھا۔ آج 11 بجے دوپہر انھیں ہزاروں افراد کی موجودگی میں ویلکم قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ ان کے پسماندگان میں چار بیٹے ڈاکٹر فیض احمد، ڈاکٹر فرید احمد، شکیل احمد اور حافظ احمد ہیں۔ انجمن محبانِ اردو دہلی، دبستان میر تقی میر دہلی، اردو تہذیب دہلی، مولانا ابوالکلام آزاد ویلفیئر اینڈ لٹریری سوسائٹی دہلی کے اراکین نے ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

رئیس احمد جعفری

● کولکاتا۔ 10 جون، مشہور صحافی و روزنامہ ''آبشار'' کولکاتا کے مدیر معاون رئیس احمد جعفری (78 سال) اپنے آبائی گاؤں، مہکار، ضلع الہٰ آباد میں انتقال کر گئے۔ تدفین ان کے گاؤں میں ہوئی۔ انھوں نے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ مرحوم 1951 میں کلکتہ آئے اور کچھ ہی دنوں کے بعد پیشۂ صحافت سے وابستہ ہوگئے۔ روزنامہ آزاد ہند، عصر جدید، اخبار مشرق، عکاس، کسان مزدور و دیگر اخبارات میں مرحوم نے صحافتی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے ''حصار'' ویکلی الہٰ آباد سے جاری کیا تھا۔ فاتح فرخ مرحوم کے اشتراک سے ''رفتار عالم'' ویکلی کولکاتا، سے نکالتے رہے۔ 1964 اور 1965 میں ڈی آئی آر میں گرفتار ہوئے تھے۔ کئی مرحلے تک مغربی بنگال اردو اکادمی کی گورننگ باڈی کے رکن رہ چکے تھے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں مغربی بنگال اردو اکادمی نے انھیں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ سے نوازا تھا۔ مرحوم کے افسانے متعدد جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب ''مغربی بنگال میں اردو صحافت'' کے ترتیب دینے والوں میں وہ بھی شامل تھے۔ ڈیموکریٹک فورم فارنیشنل انٹیگریشن، دی مسلم ویلفیئر سوسائٹی اور دیگر سماجی و فلاحی اداروں سے بھی ان کی وابستگی تھی۔ 1965 میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی (مارکسوادی) کے وہ ممبر ہوئے۔ اور 1985 میں انھیں پارٹی نے وارڈ نمبر 39 سے کولکاتا میونسپل کارپوریشن کے انتخابات کے لیے امیدوار بنایا تھا لیکن وہ معمولی ووٹوں سے شکست سے دوچار ہوئے تھے۔ 1992 سے وہ کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا تھے۔ تقریباً 8 ماہ پہلے وہ اپنے آبائی گاؤں چلے گئے تھے۔

رضا رامپوری

● بھوپال۔ 14 جون، طویل علالت کے بعد معروف شاعر، ادیب اور صحافی رضا رامپوری کا گذشتہ روز انتقال ہوگیا۔ مرحوم خیال رامپوری کے شاگرد تھے۔ رضا رامپوری عرصۂ دراز تک روزنامہ، امر اجالا اور اردو اخبار سے وابستہ رہے۔ ان کا دیوان بھی شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔ مرحوم کے ورثا میں ان کی اہلیہ کے علاوہ 3 لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ مرحوم کے انتقال سے اردو حلقوں میں مایوسی طاری ہے۔ کئی تنظیموں نے ان کی رحلت پر تعزیت کی ہے۔ مرحوم کے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے۔

❑❑❑

कौमी काउंसिल बराए फरोगे उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE
(NCPUL)
Ministry of Human Resource Development, Department of Higher Education, Govt. Of India
West Block-1,R.K. Puram, New Delhi-110066
Tel:26103381, 26103938, 26179657 Fax:26108159, E-mail:urducouncil@gmail.com
ncpultech@yahoo.co.in

Admission Notice

ONE YEAR "DIPLOMA IN COMPUTER APPLICATIONS AND MULTILINGUAL D.T.P."

Last date for submission of application form : 4th July,2009
Interview : 6th to 8th July, 2009
Display of Final List : 10th July, 2009
Classes Start from : 15th July, 2009

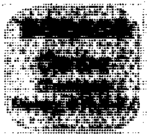

Course:

Module I: Information Technology
Module II :Business Systems
Module III: Web Application Development
Module IV: Programming through Visual Basic
Module V: Multilingual DTP
Module VI:Project Work

اہلیت: منظور شدہ بورڈ سے انٹرمیڈیٹ (10+2) اسکول یا اس کے مساوی امتحان پاس کرنے والے طلبا داخلے کے اہل ہوں گے۔ اعلیٰ تعلیمی اہلیت والے سائنس اور ریاضی کے طلبا کو ترجیح دی جائے گی۔ عرضی داخل کرتے وقت طالب علم کی عمر 17 سال سے زیادہ لیکن 35 سال سے کم ہونا لازمی ہے۔ طالب علموں کا داخلہ انٹرویو پر مبنی ہوگا جو سلیکشن کمیٹی کے ذریعہ کیا جائے گا۔

فیس: داخلے کے بعد طالب علم کو -/250 روپے ماہانہ (صوبوں کی راجدھانیوں کے لیے -/500 روپے ماہانہ) فیس ادا کرنی ہوگی - منظور شدہ سینٹر اپنے طلبا سے -/500 روپے ماہانہ (صوبوں کی راجدھانیوں کے لیے -/1000 روپے ماہانہ) لے سکتے ہیں۔

قومی اردو کونسل نے انگریزی اور ہندی میڈیم میں فاصلاتی تعلیم کے ذریعے اردو کا ایک سالہ ڈپلوما کورس شروع کیا ہے۔ سبھی طلبا کے لیے اس کورس میں داخلہ لینا لازمی ہے۔

پراسپیکٹس کے لیے اپنے نزدیکی کمپیوٹر سینٹر سے رابطہ کریں جن کی فہرست مع تفصیل قومی اردو کونسل کے ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in پر دیکھی جاسکتی ہے۔

(ڈائریکٹر)
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

تبصرہ وتعارف

کلیات چودھری محمد علی ردولوی

ترتیب وتدوین: مسعودالحق
صفحات: 344 (جلد اول)، 455 (جلد دوم)، 450 (جلد سوم)
قیمت: -/516 روپے (172 فی جلد)
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر. کے. پورم، نئی دہلی
مبصر: ایس اے رحمٰن، 1609، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، دہلی

یہ قابل تعریف اقدام ہیں کہ ہمارے اشاعتی ادارے (سرکاری اور غیر سرکاری دونوں) ہمارے اہم قلم کاروں کی نثری تحریریں بھی یکجا کرکے بطور کلیات شائع کرنے لگے ہیں۔ اب سے پہلے تو شعرا کا کلام ہی کلیات کی شکل میں سامنے آتا تھا لیکن اب مصنفین کی نثری کاوشیں بھی بطور کلیات فراہم کی جانے لگی ہیں جن سے حسب انتخاب و پسند لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے اور اس طرح کی اشاعت مکرر سے اردو کی ان علمی اور ادبی کتابوں کو جو اردو زبان وادب کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں، محفوظ کرکے نئی نسل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ ہمارا ادبی سرمایہ ہمارا قیمتی ورثہ ہے جس کے ذریعے ہمارے سامنے بیتے زمانے کے حقائق بھی آتے ہیں اور رویے بھی۔ اس میں جینے کے طور طریقے بھی ملتے ہیں اور غور وفکر کے انداز بھی۔ اپنے کلاسیکی ادب سے ہم کچھ سیکھ سکتے ہیں تو ماضی کے مطالعے سے آنے والی نسلوں کو بھی رہنمائی مل سکتی ہے۔

زیر تبصرہ کلیات، اردو کی ایک معروف شخصیت چودھری محمد علی ردولوی کی تحریروں کا مجموعہ ہے جسے مسعودالحق کی ترتیب وتدوین میں قومی اردو کونسل نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ چودھری صاحب لکھنؤ کے قریب بارہ بانکوں کی سرزمین بارہ بنکی کے ایک علاقے ردولی کے باسی ہونے کی وجہ سے اودھ کی معاشرت اور تہذیب کے پروردہ تھے۔ اودھ کی تہذیب ایک منفرد تہذیب تھی جس کی بنیاد اگرچہ دہلی کی تہذیبی روایتوں پر تھی لیکن اودھ میں اس نے ایک نیا پیکر اختیار کیا اور کئی اعتبار سے یہ دہلوی تہذیب سے زیادہ، روشن اور ترقی یافتہ ہوگئی، عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب ''گذشتہ لکھنؤ'' میں اودھ کی اس تہذیب کو مشرقی تمدن کے آخری نمونے کے طور پر شناخت کیا ہے۔ چودھری صاحب کی تحریروں میں یہی مشرقی تمدن اپنی مثبت قدروں کے ساتھ موجود ہے۔ چودھری محمد علی نے افسانے بھی لکھے اور خاکے بھی۔ مذہب پر اظہار خیال کیا تو جنس کو بھی موضوع بنایا، سوانح اور فکاہیہ بھی لکھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف موضوعات ان کے اسلوب میں ڈھل کر کلاسِک بن گئے۔ چودھری محمد علی کا ادبی اثاثہ رنگارنگ اور بھرپور ہے اور ان میں دو کتابیں وہ ہیں جن سے اردو ادب میں چودھری صاحب کی شناخت مستحکم ہوئی۔ ان میں ایک کتاب ''کشکول محمد علی شاہ فقیر'' ہے۔ اس میں ان کے وہ مضامین ہیں جو اس زمانے کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے اور پسند کیے گئے۔ ان کی دوسری اہم کتاب ''گویا دبستاں کھل گیا'' ہے۔ اس میں چودھری صاحب کے وہ خطوط یکجا کردیے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور بیٹی، داماد کو لکھے تھے اور جن کی علمی، ادبی اور معلوماتی اہمیت کے پیش نظر ان کی بیٹی ہمانے انھیں یکجا کرکے چھپوایا اور اردو ادب کا حصہ بنایا۔ چودھری محمد علی کو اردو کا اولین فطرت نگار کہا گیا تھا۔ اس کلیات میں ان کا سارا نثری اثاثہ موجود ہے لیکن بقول مرتب ہوسکتا ہے کچھ رہ بھی گیا ہو۔ چودھری محمد علی نے متعدد شعرا کے کلام کا ایک ضخیم انتخاب ''جوئبار'' کے نام سے کیا تھا، وہ اس کلیات کا حصہ نہیں ہے۔ بحیثیت مجموعی قومی اردو کونسل کی ایک قابل قدر پیش کش جس کے لیے مرتب بھی مبارکباد کا مستحق ہے۔ کتاب لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔ سرورق جاذب نظر ہے۔

انقلاب اٹھارہ سوستاون

مصنف: پی سی جوشی
صفحات: 386، قیمت: -/215 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر. کے. پورم، نئی دہلی
مبصر: عاقل زیاد، 176-B، پاکٹ-I، میور وہار، دہلی-91

ہندوستانی تاریخ میں انقلاب 1857 کا ذکر حصول آزادی کی راہ میں بطور نقطۂ آغاز ناگزیر ہے۔ برطانوی سامراج نے اسے محض ایک فوجی بغاوت کا نام دے کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ملک کی آزادی میں 1857 کا ناکام انقلاب کئی اعتبار سے اہم ہے۔ یہ انقلاب نہ صرف آزادی کی شروعات تھی بلکہ صحیح معنوں میں ملک گیر سطح پر ذہنی بیداری اور قومی یکجہتی کا بین اظہار تھا۔

''انقلاب اٹھارہ سوستاون'' پی سی جوشی کی ترتیب کردہ ایک عمدہ اور بیش قیمت دستاویز ہے۔ پی سی جوشی تاعمر کمیونزم کے سرکردہ مبلغ اور ایک سمت نما کی حیثیت سے ملک بھر میں معروف رہے۔ انگریزی زبان پر انھیں قدرت حاصل تھی اور مضمون نویسی ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ تحقیقی کاموں میں بھی انھیں گہری

دلچسپی تھی یہ کتاب بھی انگریزی میں تھی جس کا اردو ترجمہ بہت رواں ہے اور پہلی نظر میں ایسا نہیں لگتا کہ یہ کتاب ترجمہ کردہ ہے۔

تاریخ کے مطالعے کے دوران کبھی کبھی کوئی موضوع قارئین کو چونکا دیتا ہے۔ کبھی کسی نئے انکشاف پر انھیں خوشی ہوتی ہے اور کبھی طبیعت مکدر ہوجاتی ہے۔ تاریخ نویسی کی بنیاد منطقی استدلال پر ہوتی ہے اور منطق کی بنیاد کیا ہے؟ یہ بھی ظاہر ہے، عینک جیسی ہوگی دنیا ویسی ہی نظر آئے گی — بہرحال، کتاب ''انقلاب اٹھارہ سو ستاون'' کو پڑھ کر ایک طرح کی آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں معلومات کی فراہمی کی بنیاد دلیلوں اور حوالوں پر رکھی گئی ہے۔

کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں معروف تاریخ داں کے ایم اشرف، بنے گھوش اور پی سی جوشی کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین سے سولھویں عیسوی سے اٹھارھویں صدی کے آغاز تک سلسلے وار حالات و کوائف کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ ہندوستانی معیشت کا روز افزوں زوال اور انگریزی سامراج کی پیش قدمی جاگیردارانہ نظام میں مزدوروں، کسانوں، بنکروں، کاریگروں کا استحصال نیز انگریزوں کے استحصالی رویوں کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر آیا ہے۔

دوسرے باب میں دکھایا گیا ہے کہ 1857 نے ادب وفن کی دنیا پر کیا اثرات ڈالے۔ سید احتشام حسین کا مضمون ''اردو ادب اور انقلاب 1857'' پڑھنے کے لائق ہے۔ اسی طرح ''1857 اور ہندی ادب'' میں پی سی گپتا نے اس دور کے ہندی ادب کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر کے ایم اشرف نے ''غالب اور بغاوت 1857'' میں غالب کے فارسی روزنامچے ''دستنبو'' کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ گوپال ہلدر اور پی سی جوشی کے مقالوں میں بنگالی ادب اور لوک گیتوں کا سیر حاصل ذکر آیا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب اس لحاظ سے قابل مطالعہ ہے کہ اس میں 1857 کے حوالے سے ان غیر ملکیوں کا ردِ عمل پیش کیا گیا ہے جنھوں نے اس واقعے کے پس پشت کارفرما محرکات کا جائزہ غیر جانبداری اور انصاف پسندی سے لیا ہے۔ جیمز برائن کا مقالہ بعنوان ''بغاوت ہند اور برطانوی رائے'' میں مقالہ نگار نے اس عہد کے برطانوی اخبارات و رسائل نیز ذاتی خطوط کے توسط سے صحیح صورت حال کی وضاحت کی ہے اور انگریزی بربریت وحیوانیت کو بے نقاب کیا ہے۔ دیگر مضامین میں چارلس فورنین کا ''ہمعصر فرانسیسی پریس''، للیا ناڈل نوگارے کا ''اٹلی میں 1857 کی صدائے بازگشت''، پی شاستی کوکا ''1857 اور روسی پریس'' شامل ہیں۔ اسی طرح ''چین اور ہندوستان انیسویں صدی کے وسط میں'' یوشینگ دو۔ چین کن کا واقعاتی انداز میں لکھا ہوا مضمون ہے۔ اس سے اس عہد کے چینی اور یوروپی تصادم کے ساتھ ہندوستانیوں اور چینیوں کے روابط کا علم ہوتا ہے۔

یہ کتاب اہل علم ودانش کے لیے ایک بہترین تحفہ ہے۔ اس کے ترجمے اور اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارکباد کی مستحق ہے۔

معالجات

مصنف: حکیم وسیم احمد اعظمی

صفحات: 663، قیمت: 90/- روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی

مبصر: نعمان انور، روم نمبر-01، ابن بطوطہ ہوسٹل، جامعہ ہمدرد یونیورسٹی،
ہمدرد نگر، دہلی

''اردو دنیا'' مئی کے شمارے میں ''معالجات'' حصہ اول پر تبصرہ آچکا ہے۔ لہٰذا کتاب کے اغراض و مقاصد اور افادیت پر دوبارہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ حصۂ دوم بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کثیر جزئیات کا احاطہ کرتا ہے اور دقیق اجزا کی تفصیلات سے بحث کرتا ہے۔

1. امراض کبد: اس بحث کے تحت اٹھارہ ذیلی نکات ہیں۔ الگ الگ سب پر گفتگو کی گئی ہے۔ نیز لاحق ہونے والے امراض ان کے اسباب، اقسام اور طریقۂ علاج پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کبد کو اردو میں جگر کہتے ہیں۔ جگر کی تمام بیماریوں اور ان کے وجوہ پر یہ بحث صفحہ نمبر اٹھارہ سے شروع ہوکر صفحہ نمبر 108 پر ختم ہوتی ہے۔ اس سے بحث کی جامعیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

2. امراض مرارہ (Gall-Bladder): مرارہ کو اردو میں پت کی تھیلی کہتے ہیں۔ اس تھیلی میں ایک نہایت کڑوا، کسیلا سیال ہوتا ہے۔ جو حد اعتدال میں رہے تو جسم کو کثیر فائدہ پہنچتا ہے۔ اعتدال بگڑنے کے سبب بہت سی جسمانی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

یہ بحث زیادہ طویل نہیں ہے۔ اس کے صرف چار ذیلی عنوانات ہیں۔ پہلے عنوان کے تحت مرارہ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کے بعد تین عنوانوں کے تحت مرارہ سے متعلق بیماریوں کے اسباب و علاج پر بحث کی گئی ہے، جو نو صفحات پر مشتمل ہے۔

3. امراض طحال: یہ بحث گیارہ ذیلی عنوانات کے تحت ہے۔ پہلے عنوان کے تحت طحال کی تشریح کی گئی ہے۔ طحال کو اردو میں ''تلّی'' کہتے ہیں۔ ذیلی عنوانات کے تحت تلّی کی ساخت اس کی داخلی و خارجی ہیئت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی بیماریاں ان کے اسباب، علامات اور طریقۂ علاج سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

4. امراض معدہ: یہ باب بذات خود ایک پوری کتاب کے برابر ہے۔ اس کے صفحات 160 سے شروع ہوکر 403 پر ختم ہوئے ہیں۔ صرف معدے سے متعلق 29 ذیلی عنوانات ہیں۔ شروع میں معدے (Stomach) کی ساخت و ہیئت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد 28 عنوانات کے تحت معدے کے افعال نیز بیماریاں، اسباب، علامات اور علاج بیان کیے گئے ہیں۔

5. امراض امعا: امعا کو اردو میں ''لمبی آنت'' کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے Intestines کہتے ہیں۔ یہ بحث بھی کافی طویل ہے۔ اس کے تحت 23 ذیلی عنوانات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ سب سے پہلے امعا کے عمل کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کے بعد سبھی عنوانات کے تحت امعا کے امراض، اسباب، علامات اور طریقۂ علاج پر گفتگو کی گئی ہے۔

6. بانقراس (Pancreas): اس کی تشریح کے ساتھ ساتھ اس کی ہیئت اور لمبائی چوڑائی اور وزن کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے بعد تین ذیلی عنوانات کے تحت 13 صفحے پر مشتمل گفتگو کی گئی ہے۔ جو اس میں پیدا ہونے والی بیماریوں، ان کے اسباب، اقسام، علامات اور طریقۂ علاج پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے بعد دیگر 6 ابواب ہیں۔ امراض غدہ درقیہ کے تین عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ ایک کے تحت تشریح اور دو کے تحت بیماری، اس کے اسباب و علاج پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح امراض کلیہ و حالب، امراض مثانہ، امراض اعضائے تناسل مردانہ، امراض صفاق، اور آخر میں امراض نقص تغذیہ سے بحث کی گئی ہے۔ سب کے ذیلی عنوانات پر ان کے ماثرات، اسباب اور طریقۂ علاج پر گفتگو کی گئی ہے۔

''معالجات'' جلد اول کی طرح یہ دوسری جلد بھی دیدہ زیب ہے۔ اس کی چوتھی اشاعت ہے جو 2008 میں ہوئی ہے۔

دھند کی روشنی

شاعر: شہریار

صفحات: 362، قیمت: -/200 روپے

ناشر: ساہتیہ اکادمی، فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر رخسانہ عابدی، چھتاری کمپاؤنڈ، رسل گنج، علی گڑھ

ساہتیہ اکادمی نے ادب شناسی کے سلسلے میں ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کا اشاعتی پروگرام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں ''دھند کی روشنی'' کی اشاعت بھی شامل ہے۔ ''دھند کی روشنی'' شہریار صاحب کے اب تک شائع شدہ پانچ شعری مجموعوں ''اسمِ اعظم''، ''ساتواں در''، ''ہجر کے موسم''، ''خواب کا در بند ہے'' اور ''نیند کی کرچیں'' پر مشتمل ہے۔ ''دھند کی روشنی'' سے قبل شہریار صاحب کے پانچوں شعری مجموعوں پر مشتمل ایک اور مکمل مجموعہ ''حاصلِ سیرِ جہاں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اردو ادب کے شعری منظرنامے پر 1960 کے بعد جو نام رجحان ساز حیثیت سے لیے جاتے ہیں ان میں شہریار صاحب کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ شہریار اردو کے شعری افق پر ان جدید شعرا میں سے ہیں جو کبھی کسی نظریے کے حصار میں نہیں آئے اور نہ ہی کسی نظریے کی خاطر اپنی شاعری کو مجروح کیا۔ انھوں نے ابتدا سے منفرد انداز بیان اختیار کیا اور لہجے کی شگفتگی اور لفظیات کے آہنگ کے باعث اپنی اہمیت تسلیم کرائی۔ وہ جدید شعری روایت میں اختر الایمان اور خلیل الرحمن اعظمی کی طرح باطنی کشمکش کے اظہار میں اپنے وجود پر سوالیہ نشان قائم کرتے نظر نہیں آتے۔ وہ اپنے ہم عصر جدید شعرا کی طرح احساس تنہائی کا شکار ہیں لیکن ان کی تنہائی کا سبب کچھ اور ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے اظہار کی بجائے اپنی ذات کو دوسری ذات سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی شاعری کے سلسلے میں ''دھند کی روشنی'' میں لکھتے ہیں:

''میں شاعری میں اپنی ذات کو غیر ذات سے مربوط کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی لیے خود ترحمی، نعرے بازی اور جذباتیت میری شاعری میں کم سے کم ملے گی۔''

اس انتخاب میں شامل نظمیں اور غزلیں ہمیں اس لیے بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ ان میں ایک پراسرار کیفیت پائی جاتی ہے جس میں قاری اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ اس کیفیت کو قائم کرنے کے لیے انھوں نے ''خواب'' کا استعارہ اپنایا ہے۔ خواب کو انھوں نے ترقی پسندوں اور رومانیوں سے مختلف جہت عطا کی ہے۔ وہ خواب کو کسی فرار یا گریز کی شکل میں اختیار نہیں کرتے بلکہ خواب ان کے آئیڈیل کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کی شاعری سرگوشیوں میں کی جانے والی محسوسات کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں زندگی سے بیزاری نہیں ملتی بلکہ خوابوں کے توسط سے نئی زندگی کی تعمیر کی کوشش ملتی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی تفہیم کی کوشش بھی ملتی ہے۔ وہ نارسائی سے دوچار ہونے کے باعث اداس ہوتے ہوئے بھی زندگی سے بیزار نظر نہیں آتے۔ ان کے یہاں کسی طرح کی ناآسودگی کا تصور نہیں ملتا۔ شہریار کی شاعری میں Relationship کا اظہار بڑے مؤثر انداز میں ملتا ہے:

بہانہ مل گیا اس کو ترے تغافل کا
وگرنہ دل کو تو ہونا تھا بدگماں یوں بھی
(اسمِ اعظم)

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے
(ساتواں در)

سبھی کو غم ہے سمندر کے خشک ہونے کا
کہ کھیل ختم ہوا کشتیاں ڈبونے کا
ہوا چلے، ورقِ آرزو پلٹ جائے
طلوع ہو کوئی چہرہ تو دھند چھٹ جائے
(ہجر کے موسم)

آنکھوں کو سب کی نیند بھی دی خواب بھی دیے
ہم کو شمار کرتی رہی دشمنوں میں رات
زندگی جیسی توقع تھی نہیں، کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے
آج بھی ہے تری دوری ہی اداسی کا سبب
یہ الگ بات کہ پہلی سی نہیں کچھ کم ہے
(خواب کا در بند ہے)

اس شعری انتخاب میں شامل نظموں اور غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہریار نئی غزل اور نئی نظم کے قد آور شاعر ہیں۔ انسان کے باطنی تضاد، جذباتی اور حسی کشمکش کا احساس پیش کرنے کے باعث شہریار ہم عصر شعرا کے درمیان امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ ان کی انفرادیت ان کے مخصوص موضوعات کے انتخاب پر ہے:

ہم نے خود اپنی رات کو اتنا طویل کرلیا
ورنہ ہمارے دور میں جینے کا ڈھب کچھ اور ہے

ہم نے دنیا سے اپنی توقعات بہت زیادہ بڑھالی ہیں، وہی ہماری پریشانیوں کا سبب بن گئیں۔ آج کے پرآشوب دور میں جینے کا ڈھب نہ آنے کی وجوہ ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔ شعر میں رات کے استعارے نے جو خوبی پیدا کی ہے وہ قابل ذکر ہے۔ ان کا یہی استعاراتی انداز ان کی شاعری میں گہرائی اور معنویت پیدا کرتا ہے اور انھیں دوسرے شعرا سے الگ بھی۔

چونکہ ''دھند کی روشنی'' شہریار صاحب کے شعری مجموعوں پر مشتمل انتخاب ہے اسی لیے ان کی شاعری کا کچھ حصہ اس انتخاب میں شامل ہونے سے رہ گیا۔ بہتر ہوتا کہ ساہتیہ اکادمی انتخاب کے بجائے کلیات شائع کراتی تو ہم باقی کے اشعار سے لطف اندوز ہونے سے قاصر نہ رہتے مثلاً:

اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں سبھی آخر میں
حاصلِ سیرِ جہاں کچھ نہیں حیرانی ہے

ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ

مصنف: پروفیسر سید محمد عقیل
صفحات: 255، قیمت: -/300 روپے
ناشر: سید محمد عقیل، دریا آباد، الہٰ آباد
مبصر: فخر الکریم، سی 3، گلاب باڑی کالونی، الہٰ آباد-211003

پروفیسر سید محمد عقیل مارکسی دبستان تنقید کے اس شعبے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں کسی فن پارے کی جانچ اور پرکھ سماجی اور تاریخی عوامل کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ انھوں نے شاعری، افسانہ، ناول، مثنوی، مرثیہ اور دیگر موضوعات کا جائزہ سماج اور تاریخ کے دائرے میں پیش کیا ہے۔

''ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ (ہندوستان میں)'' عقیل صاحب کی تازہ تصنیف ہے جس میں ترقی پسند تنقید کی مبادیات، تعقل پسندی، حقیقت نگاری، رومانیت، جمالیات، ادب سے سماج کا رشتہ، عالمی تحریکات اور فلسفیانہ نظریات اور ان کے درمیان ترقی پسندوں کا اپنے مطمح نظر پر جو بحث کی گئی ہے وہ نہایت معلومات افزا اور دقیع ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے اپنے تمام عمر کے مطالعے کا حاصل ایک جگہ پیش کردیا ہے۔ اس تفصیلی اور مدلل بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''اردو کی ترقی پسند تنقید کا ڈھانچہ مجموعی طور پر رومانیت، حقیقت پسندی، عقلیت اور عام طور پر ایسی ہی جمالیات پر کھڑا ہے جس کا ذکر قدرے تفصیل سے اس ابتدائیہ میں کیا گیا ہے کہ یہ ساری باتیں ہیں جن پر ترقی پسند تنقید نے شروع ہی سے اپنے فکر و عمل کی بنیادیں رکھی ہیں۔'' (ص46)

کتاب کا دوسرا حصہ تنقید نگاروں سے متعلق ہے۔ اردو ترقی پسند تنقید کا سفر اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، سبط حسن سے شروع ہوکر محمد حسن، شارب ردولوی، قمر رئیس، باقر مہدی، ظ. انصاری، اصغر علی انجینئر، محمود الحسن رضوی وغیرہ کو ساتھ لیتے ہوئے نئی نسل کے ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی پر ختم ہوجاتا ہے۔ ان تمام ترقی پسند ناقدین نے اپنی تحریروں میں ادب کے مطالعے اور تفہیم کے لیے تاریخی عوامل، سماج کے تحرک اور تہذیبی عوامل کو پیش نظر رکھا ہے اور ترقی پسندی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

سارے محاسبے اور محاکے دیانت داری اور غیر جانبداری کے ساتھ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے پیش کیے گئے ہیں جو اس کتاب کا وصف خاص ہے۔ سردار جعفری کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''......حقیقت نگاری اور انقلابی حقیقت نگاری کی جو تنقیدی بحث اس کتاب میں اٹھائی گئی ہے وہ سردار جعفری کی تنقیدی سوجھ بوجھ، بصیرت اور اس وقت کے تنقیدی مسائل پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔''

آگے سردار جعفری کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''...... یقیناً سردار جعفری کے یہاں کہیں کہیں جھنجھلاہٹ اور کچھ غیر تنقیدی صورتیں بھی رونما ہو جاتی ہیں۔ کہیں ادّعائیت بھی ہے جو صرف ترقی پسند ہونے کا زعم کہا جاسکتا ہے۔ جس سے ان کی تنقید کا توازن برقرار نہیں رہتا جس کی ایک اچھے نقاد سے امید نہیں کی جاتی...... ان کے یہاں کسی حد تک جانبداری کے یک طرفہ فیصلے ہیں جو ایک اہم تنقیدی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کو داغدار بناتے ہیں......''

کتاب میں اختتامیہ کا عنوان ''ورق تمام ہوا'' غالب کے ایک شعر کا ٹکڑا ہے۔ ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے/سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے، جو اس بات کا اشاریہ ہے کہ یہ تحریر حرف آخر نہیں ہے ابھی بہت کچھ کہنے کو باقی ہے۔

اردو فکشن اور سینما

مصنف: رضوان الحق

صفحات: 258، قیمت: -/110 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 3108، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-110006

مبصر: فیروز عالم، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد-500032

''اردو فکشن اور سینما'' اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ نقش اول ہونے کے باوجود اس میں کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ مصنف نے محنت اور دیانتداری سے مواد جمع کیا ہے، اس کی چھان پھٹک کی ہے اور معروضی نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کا ذہن واضح ہے اس لیے اظہار اور بیان میں بھی پیچیدگی، ابہام اور اشکال نظر نہیں آتا۔ صاف اور دوٹوک انداز میں انھوں نے اپنی بات پیش کی ہے۔ اس کتاب کا موضوع یوں تو اردو ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ڈراموں پر بننے والی فلموں کا جائزہ ہے لیکن اس میں فکشن کے حوالے سے بھی بے حد مفید گفتگو کی گئی ہے۔ ناول، ناولٹ، افسانہ، داستان اور ڈراما میں سے کون افسانوی ادب کا حصہ ہے اور کیوں، اس کی تاویل مصنف نے مشاہیر کی پیش کردہ تعریفوں اور آرا کی روشنی میں پیش کی ہے۔

کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ہے ''ادبی و فلمی فکشن کی تعریف اور ان کے باہمی رشتے''۔ اس میں ادبی اصناف کی خصوصیات، ان کی ہیئت و تکنیک اور تقاضوں اور فلم کے لیے تیار کی جانے والی کہانیوں کی ہیئت، تکنیک، خصوصیات اور ضروریات پر روشنی ڈالی گئی۔ ایک ناول نگار یا افسانہ نگار کے پاس صرف الفاظ ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ کسی منظر یا واقعہ کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ لیکن فلم میں الفاظ سے زیادہ مناظر کی پیش کش پر توجہ رہتی ہے۔ ادب میں ایک خاص معیار کی زبان استعمال ہوتی ہے لیکن فلم کی زبان ایسی ہونی چاہیے جو تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ، تمام ناظرین آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس باب میں ادبی اور فلمی فکشن کے امتیازات اور ان کی مشترکہ خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''ادبی فکشن میں فکر و خیال کا وسیلۂ اظہار صرف لفظ ہوتے ہیں جبکہ فلمی فکشن میں مکالموں اور نغموں کی شکل میں الفاظ تو ہوتے ہی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اداکاری، مناظر، سیٹ، لباس، موسیقی اور غیر لفظی آوازیں بھی وسیلۂ اظہار ہوتی ہیں۔'' (ص 26) ادبی فکشن ایک آدمی کی کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے جبکہ فلم میں بہت سے لوگ کام کرتے ہیں۔ ادبی فکشن سے صرف تعلیم یافتہ افراد محظوظ ہوسکتے ہیں لیکن فلم سے ناخواندہ افراد بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ ان امتیازات سے قطع نظر دونوں میں قدر مشترک بھی ہے۔ مثلاً دونوں میں واقعہ اور آواز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

''سنیما کے لیے موزوں فکشن کی صفات'' کتاب کا دوسرا باب ہے جس میں تین ذیلی ابواب ہیں۔ پہلا ذیلی باب بصری فکشن ہے جس میں اس بات سے بحث کی گئی ہے کہ ''فکشن کو کس حد تک فلم کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس میں فکشن فلم دونوں کی طاقت اور حدود پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً فلم میں تشبیہ، استعارہ اور علامت سے کام نہیں لیا جاسکتا، اسی طرح سنجیدہ بحث، فلسفیانہ گفتگو اور خاموش جذبوں کے اظہار کی فلم میں گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے ذیلی باب ''خاص و عام کی دلچسپی کا فکشن'' میں عام فکشن اور فلم کا فرق واضح کرنے کے علاوہ فلم کو خاص و عام میں یکساں مقبول بنانے کے لیے مواد اور ہیئت سے متعلق چند فارمولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً عشق، جنس، تفریح، مزاح، جنگ و جدل، انسانی رشتوں کی کشمکش، تہذیبی اقدار، لوک کہانیاں، مذہبی عقیدت، اساطیر وغیرہ فلم کے محبوب و مرغوب موضوعات ہیں۔ فلم کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اسے کتنی فنکاری اور ہنرمندی سے پیش کیا جاتا ہے۔

''وسائل کی مناسبت سے فکشن'' میں فلم کی کہانی اور فلم ساز کو دستیاب وسائل کے تعلق پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ فلم ساز کی ترجیح، مقصد، بجٹ اور کہانی کا آپس میں گہرا رشتہ ہے اور اسے نظر انداز کر کے فلم نہیں بنائی جاسکتی۔

''ادبی اصناف پر مبنی فلمیں'' کتاب کا تیسرا باب ہے جس میں اردو افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور داستانوں پر بننے والی فلموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اصل متن میں فلم کی ضرورت کے تحت کس طرح کی تبدیلیاں کی گئی ہیں، ترمیم و اضافے کیے گئے ہیں یا بعض واقعات اور مناظر کاٹ دیے گئے ہیں، ان تمام امور سے واقف کرایا گیا ہے۔ اصل متن اور فلم کے اسکرپٹ کو حوالے کے طور پر پیش کر کے زبان کی سطح پر آنے والی تبدیلیوں سے بھی مصنف نے روشناس کرایا ہے۔

اس فن میں ستیہ جیت رے کی فلم ''سدگتی'' (پریم چند کے افسانے ''نجات'' پر مبنی) گلزار کی فلم ''اچانک'' (خواجہ احمد عباس کے افسانے ''دل ہی تو ہے'' پر مبنی) شیام بینیگل کی فلم ''منڈی'' (غلام عباس کی کہانی ''آنندی'' پر مبنی) مرنال سین کی تیلگو فلم ''اوکااوری کتھا'' (پریم چند کی ''کفن'' پر مبنی) رشی کیش مکھر جی کی ''گڈی'' (گلزار کی کہانی) فریدہ مہتا کی ''کالی شلوار'' (منٹو کی کہانی) اور اے آر کاردار کی فلم ''سوامی'' (پریم چند کے افسانے ''عورت کی فطرت'' پر مبنی) وغیرہ کا ذکر ہے۔

اردو کے کئی ناولوں پر بھی کچھ اچھی اور کچھ اوسط درجے کی فلمیں بنی ہیں۔ مصنف نے ان فلموں کی خوبیوں اور فنی و تکنیکی خامیوں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اس ذیل میں پریم چند کے ناول ''گئودان''، ''بازار حسن''، ''چوگان ہستی''، ''غبن'' عصمت چغتائی کے ''ضدی'' رسوا کے ''امراؤ جان ادا'' راجندر سنگھ بیدی کے ''ایک چادر میلی سی'' اور علیم مسرور کے ''بہت دیر کردی'' وغیرہ ناولوں پر مختلف فلم سازوں کی بنائی ہوئی فلموں پر گفتگو کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں اردو افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور داستانوں میں کہانی، مرکزی خیال، تکنیک اور زبان کی سطح پر کی جانے والی تبدیلیوں اور پانچویں باب میں ان تبدیلیوں کی وجوہات مثلاً پیشہ ورانہ ضروریات، فلم ساز کی سوچ، نظریۂ حیات اور اس کی سماجی و سیاسی فکر وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔ ''افسانوی ادب اور فلموں کے فن کا تقابلی مطالعہ'' اس کتاب کا آخری باب ہے جس میں تمام مباحث کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں کتابیات اور اشاریہ کے تحت زیر بحث آنے والی تمام فلموں، ادبی تخلیقات اور اشخاص (ادیبوں فلم سازوں، اداکاروں اسکرپٹ رائٹروں وغیرہ کی تفصیل درج ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

موج موج دریا

شاعر: ظفر انصاری ظفر
صفحات: 180، قیمت: -/200 روپے
ناشر: علمی مجلس بہار، اشوک راج پتھ، پٹنہ-4
مبصر: ڈاکٹر منظر اعجاز، B-67، پی بی کالونی، کنکو باغ، پٹنہ-800020

ظفر انصاری ظفر اردو کے ایک نوجوان اور فعال قلم کار ہیں۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں، لیکن نثر نگاری سے بھی انھیں دلچسپی رہی ہے۔ انھوں نے کئی کتابوں کی ترتیب و تدوین خوش سلیقگی سے کی ہے۔ ظفر کے دوہوں کا ایک مختصر مجموعہ ہندی رسم الخط میں شائع ہو چکا ہے اور وہ بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ زیر تبصرہ مجموعۂ غزل ان کی کم و بیش چار سال کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی پہلی ہی غزل کے حمدیہ اشعار میں ایک شعر پر یک لخت نظر ٹھہری اور جم سی گئی:

تجھی سے مجھ کو ملی ہے متاعِ دردِ جگر
ترے کرم ہی سے اشکوں میں یہ روانی ہے

ایسے روحانی وجدانی معنویت کے حامل اشعار اور بھی ہیں، سماجی و سیاسی موضوعات کو بھی ظفر نے اپنے بعض اشعار میں گہری معنویت سے ہم کنار کر دیا ہے:

کریں گے یہاں سے نہ ہجرت پرندے
ادھر اب کے ہوں لاکھ موسم سہانے

''پرندے ہجرت نہیں کریں گے'' سے لہجے کی قطعیت واضح ہے۔ ایک دوسرے شعر میں ایک اخلاقی آفاقی تصور کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے، لہجے کی برجستگی بھی بطور خاص متاثر کرتی ہے:

وقت کے ساتھ نکل آتا ہے ہر غم کا علاج
وقت کے ساتھ ترے زخم بھی بھر جائیں گے

غزل کا فن بنیادی طور پر رمزیت، ایمائیت اور اشاریت کا فن ہے اور اس وجہ سے اس کا حاشیۂ تاویل وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ ظفر کے بعض اشعار میرے خیال میں وسیع تر حاشیۂ تاویل کے حامل ہیں۔ انھیں مختلف معنوی تناظرات میں دیکھا جا سکتا ہے:

دل کے جذبات میں ہلچل سی مچے اب کیوں کر
موج گل، رقص صبا، کچھ بھی گلستاں میں نہیں
یہ الگ بات کہ چھوڑی نہ کبھی رسم وفا
بارہا میں نے کی محسوس تری ہاں میں نہیں
عشق میں کچھ بھی کام نہ آیا، ہم قسمت سے ہار گئے
شام کے آنسو، صبح کے نالے، سب کے سب بیکار گئے
دل کے ویرانے میں بیٹھا خون کے آنسو روتا ہوں
جب سے شیش محل خوابوں کے کر کے تم مسمار گئے

اپنی لفظیاتی تنظیم کی وجہ سے یہ اشعار دل کو چھو جاتے ہیں۔

ظفر انصاری ظفر کے وہ اشعار جو چھوٹی بحروں میں ہیں، سادگی میں پرکاری کی بہترین مثال قرار دیے جا سکتے ہیں:

دوست نہ مل جائے دشمن سے
دل میں خوف سدا رہتا ہے
میں جاگوں تیری یادوں میں
جب ساری دنیا سو جائے
چار دن کا میلہ ہے
رہنا پھر اکیلا ہے

ظفر نے ناصر کاظمی کی زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور یہ غزلیں اپنی تازگی اور روایتی اقدار کے امتزاج کے سبب روایت و اجتہاد کی بہترین مثال بن گئی ہیں، جس کی طرف ڈاکٹر انور پاشا نے بھی اشارہ کیا ہے اور جناب مخمور سعیدی نے بھی۔ ظفر کے یہاں میر کے اثرات بھی ملتے ہیں، لیکن ان کا انداز مقلدانہ نہیں، جدت پسندانہ ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:

میر صاحب سے ظفر اتنی شکایت ہے مجھے
رکھ دیا بدنام کر کے عشق میں سادات کو

ظفر کی غزلوں پر جہاں پروفیسر وہاب اشرفی جیسے معمر نقاد اور مخمور سعیدی جیسے معتبر شاعر نے اظہار خیال کیا ہے، وہیں ڈاکٹر انور پاشا جیسے جواں سال تنقید نگار نے بھی رائے زنی کی ہے اور بہ اعتبار مجموعی ان حضرات نے ظفر کے خوش آئند مستقبل کی بشارت دی ہے۔ ظفر انصاری ظفر نے ''غبار دل'' کے ذیلی عنوان کے تحت اپنا خیال ظاہر کیا ہے جس سے ان کے تخلیقی محرکات وعوامل کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ظفر نے اپنا یہ مجموعۂ غزل اپنے استاد ڈاکٹر مظہر مہدی کے نام معنون کیا ہے، جس سے ظفر کی سعادت مندی کا بجا طور پر احساس ہوتا ہے۔

مولانا اسلم جیراجپوری: ایک ہمہ جہت شخصیت

مصنف: شاہد نوخیز اعظمی

صفحات: 205، قیمت: -/250 روپے

ناشر: کتابستان، چندوارہ، مظفر پور، بہار

مبصر: ڈاکٹر شمیم خان، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی

مولانا اسلم جیراجپوری صرف محقق، مورخ، شاعر ونقاد ہی نہیں بلکہ ایک تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی کے مانند وہ بھی صرف اعظم گڑھ کے لیے ہی فیضان تجلی نہ تھے بلکہ پورے ملک وملت کے لیے نیر اعظم ثابت ہوئے۔ اسلامی علوم وفنون کے ساتھ جدید علوم وفنون اور جدید تر اصول درس وتدریس کے نکتہ داں تھے جسے علی گڑھ اور جامعہ ملیہ سے وابستگی نے دوآتشہ کیا۔

زیر تبصرہ کتاب میں موصوف کی گوناگوں خصوصیات، علمی وادبی فتوحات کو موضوع بنا کر ان کی جامع کمالات شخصیت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول ''مولانا اسلم جیراجپوری کے عہد کا علمی وادبی ماحول'' ہے۔ اس باب میں 1857 کے ولدوز وقیامت خیز واقعات اور مغلیہ سلطنت کے سوا تین سو سال سے ضیاپاش آفتاب کے غروب ہونے اور ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے آغاز کا بالتفصیل ذکر ہے۔ شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک، دیوبند تحریک، علی گڑھ تحریک، علامہ شبلی اور علی گڑھ تحریک، ندوۃ العلما تحریک، وقف علی الاولاد تحریک، تحریک اشاعت اسلام اور جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک کا تاریخی وتنقیدی جائزہ بھی اس باب میں شامل ہے۔ نیز ان تحریکوں کی افادیت، معنویت، ہمدردانِ قوم کی ان تحریکوں سے وابستگی اور علاحدگی کو موضوع بنا کر اس پورے عہد کی سماجی، سیاسی، مذہبی، علمی اور معاشی تصویر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ کس طرح تیزی سے بدلتے ہوئے منظر نامے نے روشن اذہان کو اپنی جانب ملتفت کیا اور ان کی ترجیحات زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی گئیں اور انھوں نے خود مشرق ومغرب کے سرچشموں سے فیضیاب ہونے کے بعد گم گشتہ مقام و مرتبے کی بازیافت کی کوشش کی۔

دوسرا باب، اسلم جیراجپوری احوال وآثار'' ہے۔ اس باب میں مولانا کی علمی سرگرمیوں، تصنیفات، مشاہیر علم وآگہی بشمول علامہ اقبال سے وابستگی، مختلف نظریات (خصوصاً تفسیر قرآن سے متعلق) کا بیان ہے۔ خاص کر قرآنیات، اسلامیات اور تاریخ اسلام پر ان کی متعدد کتابوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تاریخ القرآن، حیات حافظ، حیات جامی، سیرت عمرو بن عاص، تاریخ نجد، تعلیمات قرآن وغیرہ جیسی تصنیفات کے علاوہ ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کو بنظر غائر دیکھا گیا ہے اور ''جواہر ملیہ'' میں شامل قومی نظموں کو ان کی سخن سنجی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا باب ''مولانا اسلم جیراجپوری بحیثیت مورخ'' ہے۔ تاریخ مختلف المعانی اصطلاح ہے۔ مختلف مکاتیب فکر نے اپنے نظریات کے مطابق اس کے دائرۂ عمل اور سروکار کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی کے نزدیک تاریخ انسانی حماقتوں، جرموں اور بدبختیوں کے رجسٹر کے سوا کچھ نہیں، تو کسی کے نزدیک اصلاح نفس کا ذریعہ، ہر دور اور ہر ملک وقوم میں تاریخ نویسی کے الگ الگ رجحانات کارفرما رہے ہیں۔ تاریخ کی تدوین واشاعت کی اہمیت ومعنویت اور طریقۂ کار بھی ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے بھی ان نکات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ عہد مغلیہ اور برطانوی دور میں فارسی زبان میں فن تاریخ نویسی پر بحث کے بعد اسلم جیراجپوری کی مختلف تاریخی کتابوں، مضامین خصوصاً تاریخ الامت، تاریخ نجد اور سیرت عمرو بن عاص پر سیر حاصل بحث کی ہے اور بحیثیت مورخ ان کی خدمات کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔

چوتھا باب ''مولانا اسلم جیراجپوری بحیثیت نقاد'' ہے۔ تنقید کی ابتدا، ارتقا اور اس کی تعریف کے بعد مولانا کی دو مشہور کتابوں ''حیات حافظ'' اور ''حیات جامی'' پر تنقیدی بحث کی گئی ہے اور ان دو کتابوں کے حوالے سے جو محققین اور ناقدین کی نظر میں ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں، حافظ شیرازی اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کی شخصیت عیاں کرنے کے ساتھ ساتھ مولانا موصوف کی تنقیدی بصیرت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ''پیام مشرق''، جاوید نامہ، اسرار خودی وغیرہ پر ان کے ناقدانہ تبصروں کا

بھی محاکمہ ہے۔

پانچواں باب مولانا اسلم جیراجپوری بحیثیت شاعر“ اور چھٹا باب ”اردو زبان وادب میں مولانا کا مقام“ ہے۔ مولانا کو عربی و فارسی اور اردو زبان پر یکساں قدرت تھی۔ اردو اور فارسی کو انھوں نے اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ اسلامی نظریات، خیالات اور اسلامی واقعات کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ”جواہر ملیہ“ کی نظمیں ان کی کہنہ مشقی اور فکروفن کے حسین امتزاج کی واضح مثالیں ہیں۔ ان کی نظم ”تحفۂ ایمان“ کا یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے:

دہر میں مسلم ہے حق کی آزمائش کے لیے
تمغۂ ایماں نہیں ملتا نمائش کے لیے

ان ابواب میں مصنف نے ان کی مختلف نظموں کا تجزیہ کرنے کے بعد معاصرین و ناقدین کی نظر میں ان کے مقام و مرتبے کا جائزہ لیا ہے اور ان کی اردو زبان و ادب کی خدمات کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی کی محنت اور موضوع سے ان کی ذہنی ہم آہنگی قابل داد و ستائش ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس کی طباعت پر مزید توجہ صرف کی جاتی۔

* * *

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپئے مجلد، 336 روپئے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپئے مجلد، 410 روپئے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کر لینا آسان ہو گیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ”تمہید“ کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جا سکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شجاع الدین شاہد

خدمت خلق ہی عبادت ہے

بات آزادی کے قبل کی ہے، دکن کا علاقہ اس وقت نظام کی سلطنت میں شامل تھا۔ ودربھ بھی اسی کا حصہ تھا۔ اس علاقے کا ایک گاؤں دریاپور جسے دریا خان نے آباد کیا تھا، وہاں احمد نامی ایک زمیندار رہتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی زمین پر کاشت کرتا تھا۔ وہ خوب محنت کرتا اور اسی محنت کی بدولت اس کی زمین سونا اگلتی۔ دھیرے دھیرے اس کا شمار اس علاقے کے بڑے زمینداروں اور رئیسوں میں ہونے لگا۔ کئی ایکڑ زمین کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی بڑا وسیع تھا وہ بلاتفریق مذہب، غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرتا۔ گاؤں کے ضرورت مندوں کے علاوہ وہ پاس پڑوس کے گاؤں والوں کی بھی مالی مدد کرتا رہتا۔ اسی وجہ سے اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

ایک بار کا ذکر ہے، اسے کسی کام کے سلسلے میں دوسرے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں سفر بیل گاڑیوں یا گھوڑے گاڑیوں پر کیا جاتا تھا۔ موٹر گاڑیاں ابھی وہاں نہیں پہنچی تھیں۔ وہ اپنی گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ اسے جس گاؤں جانا تھا وہ ست پڑا پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ اس گاؤں کا نام لال کھیڑ تھا۔

جنگلوں سے گھرا راستہ تھا۔ ڈاکوؤں کی دہشت بھی عام تھی۔ جو مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ احمد بھی اس سفر میں ڈاکوؤں کی لوٹ کا شکار ہوگیا۔ اس کا سارا اثاثہ لوٹ لیا گیا۔ وہ اس لٹی پٹی حالت میں ہی لال کھیڑ پہنچ گیا۔ اسے امید تھی کہ چونکہ اس گاؤں کے لوگ اس کی دریا دلی سے واقف ہیں اور سبھی نے اس سے مالی فیض اٹھایا ہے اس لیے اسے دیکھتے ہی اس کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے، مگر اسے مایوسی ہوئی اور حیرانی بھی کہ کسی نے بھی نہ اس کی خیریت پوچھی نہ حال دریافت کیا۔ بلکہ سبھی نظریں بچا کر گزر گئے۔ وہ دل برداشتہ ہوکر واپس اپنے گاؤں کی سمت چل پڑا۔ وہ اداس اور دل برداشتہ تھا اور اس نے دل میں طے کرلیا تھا کہ وہ اب کسی کی مدد نہیں کرے گا۔ وہ کافی تھک چکا تھا، اس کی نظر ایک آم کے درخت پر پڑی جس کی شاخیں آموں سے لدی ہوئیں تھیں۔ وہ درخت کے قریب پہنچ گیا۔ لذیذ آموں سے اپنی بھوک مٹائی اور گھنے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں ستانے لگا کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ تب خواب میں اسے ایک بزرگ نظر آئے جنھیں دیکھ کر فرشتے کا گمان ہوتا تھا۔ احمد نے ان بزرگ کو اپنی ساری داستان کہہ سنائی تب بزرگ نے کہا:

"دیکھو میاں"! اپنا کام کرتے جاؤ، پھل کی فکر نہ کرو۔ اچھے اور نیک عمل کا اجر اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ اب دیکھو نا یہ درخت جس کی گھنی چھاؤں میں تم نے آرام کیا، جس کے لذیذ پھلوں سے تم نے اپنی بھوک مٹائی۔ کچھ دیر بعد تم یہاں سے چلے جاؤ گے لیکن یہ پیڑ برسوں سے یہیں کھڑا ہے۔ سبھی مسافر اس کی چھاؤں اور پھلوں سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ آج تک کسی نے بھی اس کا شکریہ ادا نہیں کیا تو کیا اس درخت نے پھل پیدا کرنا اور چھاؤں دینا بند کردیا؟ اس درخت نے تو کبھی شکایت نہیں کی بلکہ ہر ضرورت مند کی مدد کرتا رہا۔ ادھر دیکھو، وہ شاہ نور ندی جو صدیوں سے بہہ رہی ہے، اپنا فرض سمجھ کر سب کی پیاس بجھا رہی ہے۔ قدرت نے تمام مخلوقات کو دوسروں کی فلاح و بہبود اور ایک دوسرے کو فیض پہنچانے کے لیے پیدا کیا ہے۔ انسانی زندگی کا بھی یہی مقصد ہے کہ اس سے تمام انسانوں کو فیض پہنچتا رہے۔" جب احمد کی آنکھ کھلی تو اس کی سمجھ میں سب کچھ آچکا تھا۔

□□□

75/599, M.H.B. Colony, Block No.8, Malwani, Malad (W), Mumbai-400095

قمر غزالہ

حقوق و فرائض سے چشم پوشی

خدا کے لیے کچھ کریں...... جلدی سے ڈاکٹر کو بلائیں...... میرا بھائی بے ہوش ہے اور اس کے کافی چوٹیں لگی ہیں...... ایک مشہور و مقامی اسپتال کے استقبالیہ کاؤنٹر پر ایک نوجوان گھبرایا ہوا، التجائیہ انداز میں چیخ رہا تھا، کیوں کہ اس کا بھائی ایک سڑک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا تھا...... لیکن ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ پہلے فیس وغیرہ جمع کی جائے، تب ہی معائنہ کریں گے۔ اس نوجوان کو فیس جمع کرانے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا کیونکہ فیس کے ہمراہ دو تین طرح کے فارم بھی پُر کرنے تھے۔ بعد ازاں ڈاکٹر، زخمی کو دیکھنے آیا، لیکن اس وقت تک زخمی کو کسی علاج یا ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہی تھی اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

"ڈاکٹرز، جن کو مسیحا کہا جاتا ہے، کیا ان کی یہی ذمے داری ہے؟"

ایک ہفتے پہلے کچھ شرپسندوں نے ہمارے پڑوسی کی نہ صرف گاڑی چھین لی تھی بلکہ فائر کر کے ان کے معصوم بیٹے کو بھی ہلاک کر دیا تھا۔ پڑوسی اپنے نوجوان، بے قصور اور معصوم بیٹے کی جدائی کے غم میں بے حال ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ قاتل کو گرفتار کیا جائے اس غرض سے وہ گزشتہ کئی دنوں سے روزانہ ایف آئی آر درج کروانے تھانے جا رہے ہیں لیکن کوئی سنوائی نہیں ہو رہی۔

"کیا پولیس کی یہی فرض شناسی ہے؟"

ایک ضعیف، ناتواں بزرگ، جو اس بڑھاپے میں چار مہینے سے پینشن کے لیے دفتروں کے چکر لگا رہے ہیں، لیکن کام ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آئی۔ کبھی مطلوبہ شخص اپنی سیٹ پر نہیں ہوتا، کبھی ملازمین اپنی جیب گرم کرنے کے لیے دباؤ ڈالتے ہیں۔

کیا اسی کو احساسِ ذمے داری کہتے ہیں؟...... تاجر حضرات، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری جیسی صفات اپنا کر اپنے فرائض بھرپور طریقے سے انجام دے رہے ہیں! جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ناپ تول میں کمی، لوٹ مار کر کے اور ناجائز طریقے سے مال کمانا حرام ہونے کے ساتھ غیر قانونی، غیر سماجی اور غیر انسانی فعل ہے۔

اگر ہم غور کریں تو معاشرے کا ہر فرد ہی احساسِ ذمے داری سے عاری نظر آئے گا۔ سڑک پر نظر ڈالیے تو پیدل چلنے والے اور گاڑیوں میں سفر کرنے والے دونوں ہی اپنی اپنی ذمے داریوں سے لاتعلق دکھائی دیتے ہیں۔ نہ گاڑی والوں کو ٹریفک کے اصول وضوابط کا کچھ پاس ہوتا ہے اور نہ ہی پیدل چلنے والوں کو اپنے فرائض کا احساس ہوتا ہے، دونوں ہی اپنی دنیا میں مگن بس چلتے ہی چلے جاتے ہیں بغیر کسی ہارن یا ہیڈلائٹ کے اچانک کسی گاڑی کا سامنے آ جانا، گاڑیوں کو اوورٹیک کرنا، گاڑی میں بلند آواز سے ڈیک بجانا

اور غیر ذمے دارانہ ڈرائیونگ کرنا۔ یہ سب غیر ذمے دارانہ حرکتیں ہیں۔

اس طرح کے رویوں اور قوانین سے لاتعلقی ہی بہت سے بڑے حادثات کا سبب بنتی ہیں مثلاً راہ چلتے ہوئے مختلف قسم کے ریپر، ڈبے، بوتلیں، پھلوں کے چھلکے پھینک دینا، جو نہ صرف شہر کی خوبصورتی پر بدنما داغ ہیں بلکہ آلودگی اور حادثات کا بھی پیش خیمہ ہوتے ہیں جبکہ گلی، محلے اور بازاروں کو صاف ستھرا رکھنا ہر شہری کی ذمے داری ہوتی ہے، اگر ہم اپنی ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں تو بڑھتی ہوئی آلودگی، امراض اور حادثات کو روکنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

آج ہمارا ملک جن حادثوں اور سازشوں کا شکار ہے، اس کی ایک اہم وجہ ہماری ملکی و قومی معاملات میں لاتعلقی اور لاپروائی ہے، جبکہ ہماری پہچان، ہمارا ملک ہے۔ لہٰذا وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم متحد ہو کر اپنے ملک اور اس کے نظریات کے ساتھ ساتھ اس ملک میں رہنے والے سبھی مذاہب کے لوگوں کی بلالحاظ مذہب و ملت حفاظت کریں اس میں ہم سب کی بقا ہے۔ یہ ہر ذمے دار شہری کا فرض ہے۔

ہر شخص پر، ہر وقت، کسی نہ کسی حوالے سے، خواہ اس کے پیشے کے تعلق سے ہو، رشتے کے تعلق سے یا کسی جگہ خود اس کی ذاتی حیثیت کے حوالے سے ہو، کوئی نہ کوئی ذمے داری ضرور عائد ہوتی ہے۔ اس ذمے داری کو سمجھنا اور بہتر طریقے سے ادا کرنا ہی اس شخص کی کامیاب زندگی کا راز ہے۔ ایسا شخص سلجھی ہوئی اور خود اعتماد شخصیت کا مالک ہوتا ہے، وہ اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی فلاح و بہبود کا سبب ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ہر جگہ ہر دل عزیز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنی ذمے داریوں سے لاپرواہ ہوتا ہے، اس کی زندگی میں نہ کوئی نظم وضبط ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مقصد۔ ایسا شخص لوگوں کے مسائل کا یا پھر دل آزاری کا سبب ہوتا ہے اور دوسروں کے دل میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

خود غرضی، مفاد پرستی، کاہلی حسد اور سستی انسان کو غیر ذمے دار بناتی ہے، یہ ایسی اخلاقی برائیاں ہیں جو انسان کو تباہ کر دیتی ہیں۔ جب یہ برائیاں کسی معاشرے میں عام ہو جائیں تو معاشرے کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ الغرض...... آج ہمارے معاشرے میں بڑھتی ہوئی بدنظمی و انتشار، بے چینی و اضطراب کی ایک اہم وجہ احساسِ ذمے داری کا نہ ہونا ہے۔ اگر معاشرے کا ہر فرد اپنی اپنی جگہ، اپنی اپنی ذمے داریوں کو سمجھنے لگے اور ان سے چشم پوشی کی کوشش نہ کرے تو نہ صرف ہمارے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں بلکہ ہم دنیا میں ایک باوقار اور خود اعتماد قوم کی حیثیت سے ابھر سکتے ہیں۔

□□□

550, Hakim-G Street, Churi Walan, Delhi-110006

اردو کے مشہور اور مستند شاعر اور نقاد **خلیل الرحمٰن اعظمی** کی اہم کتابیں جو ایک عرصے سے نایاب تھیں، قومی اردو کونسل نے خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کی ہیں۔ ہر اچھی اردو لائبریری میں ان کتابوں کی موجودگی ضروری ہے

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

اپنے وقت کی سب سے اہم ادبی تحریک کا بھرپور تعارف جو ترقی پسند تحریک کے نام سے 1935 میں شروع ہوئی اور پندرہ سے بیس سال کی مدت میں جس نے ادیبوں اور شاعروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا—– اس تحریک کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے غیر جانبداری کے ساتھ تحریک کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے اور تحریک سے وابستہ اہم قلمکاروں کے فکر و فن پر بھی گفتگو کی ہے۔

صفحات: 410، سائز ڈیمائی، قیمت: -/241 روپے

مقدمۂ کلامِ آتش

خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری پر یہ مبسوط مقالہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے 1948 میں، جب وہ بی. اے. کے طالب علم تھے، تحریر کیا تھا۔ جب یہ مقالہ بالاقساط ''نگار'' میں شائع ہوا تو نیاز فتحپوری نے اسے اپنے ادارتی نوٹ میں سراہتے ہوئے لکھا کہ ''جناب اعظمی جس دقتِ نگاہ اور امعانِ نظر سے کام لے رہے ہیں، وہ آتش کے باب میں اس وقت تک کسی بھی صاحب قلم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی۔'' بابائے اردو مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبداللہ، وحید قریشی اور دیگر کئی اکابر نے بھی اس مقالے پر اپنی بھرپور پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔

صفحات: 134، سائز ڈیمائی، قیمت: -/139 روپے

زاویۂ نگاہ

یہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں پانچ مضامین پانچ اہم شخصیتوں سرسید، ابوالکلام آزاد، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری اور اختر الایمان کے حوالے سے ہیں۔ ایک مضمون میں ''اردو تنقید کے مسائل'' پر گفتگو ہے اور ایک مضمون کا عنوان ہے ''اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ'' باقی دو مضامین ہیں: ''اردو شعر و ادب میں علی گڑھ کا حصہ'' اور ''دو نئے شعری مجموعے''۔

صفحات: 184، سائز ڈیمائی، قیمت: -/138 روپے

فکر و فن

خلیل الرحمٰن اعظمی مروجہ تنقیدی اصولوں اور نظریات کی پابندی کو ناگزیر نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ادب کا براہ راست مطالعہ کر کے ادب کی خصوصیت کو سمجھنے اور اس کا معیار متعین کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کتاب میں ان کے دس مضامین شامل ہیں جو بالترتیب، غالب، ظفر، خواجہ میر درد، حسرت، داغ، مومن، جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، مجاز اور جذبی کے فکر و فن کے محاسبے پر مبنی ہیں۔

صفحات: 205، سائز ڈیمائی، قیمت: -/151 روپے

مضامینِ نو

یہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضامین کا آخری مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں مرتب کیا۔ اس میں شخصیتوں پر بھی مضامین ہیں، عصری ادبی صورت حال کا بھی ذکر ہے، کچھ مسائل پر اظہار خیال ہے اور کچھ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ تبصرے انھی کتابوں پر ہیں جن کی اشاعت کے بعد ادبی منظرنامے میں کچھ چہل پہل نظر آئی اور مسائل بھی وہی اٹھائے گئے ہیں جو اہم تھے اور اہل نظر کی توجہ کے طلب گار۔

صفحات: 240، سائز ڈیمائی، قیمت: -/172 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

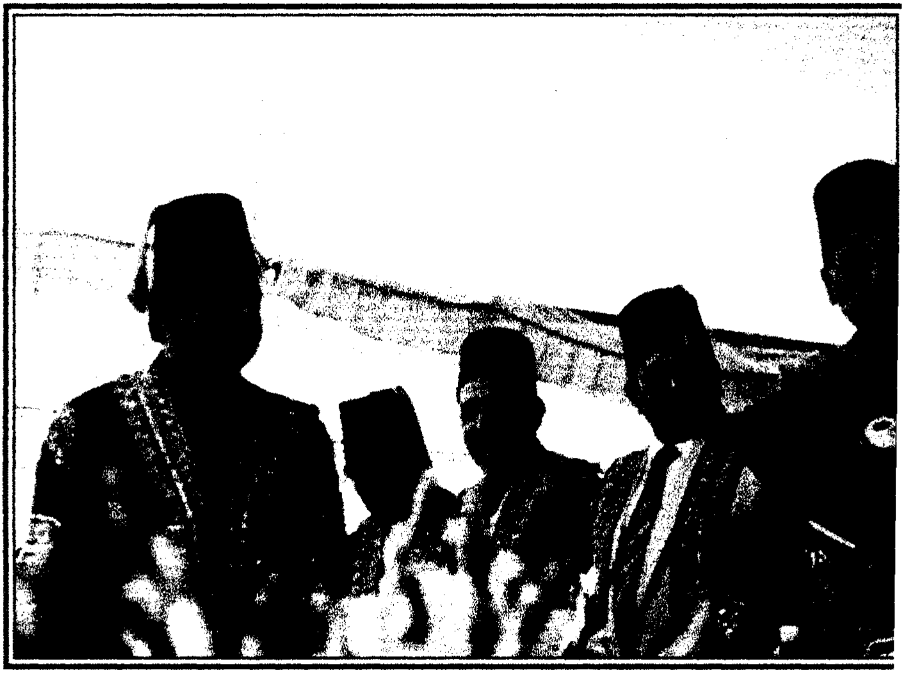

آسکر انعام یافتہ موسیقار اے. آر. رحمٰن کے فنی کارناموں کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر
جناب ای. ایم. احمدی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

[illegible]
Date of Publication 24/06/2009
Date of Dispatch 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, July 2009, Vol 11, Issue: 7
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

ہندوستانی تھیٹر کے آسمان کا روشن آفتاب جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا

جناب حبیب تنویر

ولادت— یکم ستمبر 1923   وفات—8 جون 2009

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram,
New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020
on 70 GSM Paper produced by TNPL   Editor Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel: 26103381, 26103938